

# خدا کا



المرآة

ایک اصلاحی معاشرتی ناول

# خدا کہاں ہے

۱۱/۱۱

اسلام برحق

ایم اے

خدا کہاں ہے



ناشر

مکتبہ القریش چوک اردو بازار سرکلر روڈ، لاہور

مکتبہ القرآن

# خدا کہاں ہے

اسلم راہتی  
ایم۔ اے

۱۱/۱۱/۱۱



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : [www.iqbalkalmati.blogspot.com](http://www.iqbalkalmati.blogspot.com)

اس نادرے کے تمام واقعات، مقام، کردار فرضی ہیں  
کسی قسم کے مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی  
جن کا مصنف پاپلسر ذمہ دار نہیں ہوگا



## جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

اخذ و نقل اور سکریں پلے کیلئے مصنف کی اجازت ضروری ہے

ناشر ————— مکتبہ القریش اردو بازار لاہور

بار اول ————— ستمبر ۱۹۸۱ء

مطبوعہ ————— منظور پرنٹنگ پریس اردو بازار لاہور

تعداد ————— ۱۱۰۰

قیمت ————— ۲۳ روپے

کتابت ————— محمد رفیق بٹ

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور

Handwritten signature or stamp at the bottom left.

# انتساب

خدا کی ہستی کے منکر ،

ملحدوں ، فاسقوں ،

اور

فاجبروں کے نام ،



سہیل رائے ایم اے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کا نام تو عظیم تھا۔ پر زمانے کے تیز دانوں اور اہرمنوں نے اسے کوئی عظمت نہ دی۔ بلکہ روشنی اور تاریکی کی جنگ میں اس پر ایسے ستم ڈھائے کہ اس سے اس کی زندگی کا ضمیر چین کر اسے خدا کا منکر و ملحد بنا دیا۔ اس نے امن اور تہذیب کی بھیک مانگی۔ جواب میں ان نکھر لوگوں نے اسے غم اور شقاوت دیتے اس نے محنت کر کے ایک کامیاب انسان بنا چاہا لیکن سانپ کی طرح کینچلی بدلنے والے لوگوں نے اس کی جھولی میں گر سنگی اور فاقہ کشی ڈال دی۔ اسے ایک غیر مجاز انسان جان کر اور اس کے قلبی اسرار کو جانے بغیر اسے ایک مستعمل گیند کی طرح ادھیڑ کر رکھ دیا۔ ورنہ وہ نانا تو دن رات محنت کر کے وابستگان کا پیٹ پال رہا تھا۔

آج بھی جب وہ گھر داخل ہوا تو بے حد خوش تھا۔ جاڑا اپنے عروج پر تھا اور



زمستانی ہوائیں تیزی سے چل رہی تھیں۔ وہ بڑا مطمئن تھا پہینے کی یکم تھی اور اسے تنخواہ ملی تھی۔ ہاتھ میں دو بندل پکڑے جب وہ اپنے گھر کے برآمدے میں داخل ہوا تو وہاں اس کی ماں کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے ماں کو سلام کیا اور اس کے قریب آکھڑا ہوا۔ ماں جس کا نام ریحانہ تھا۔ آگے بڑھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر سامنے والے کمرے میں لے گئی۔

کمرے میں دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ دونوں اس کی بہنیں تھیں۔ ایک جو جوان تھی اس کا نام عطیہ تھا اور وہ بی۔ اے کرچکی تھی اور دوسری جو ننھی مٹی بچی تھی۔ صائمہ تھی اور تیسری میں پڑھتی تھی۔ بھائی کو دیکھتے ہی دونوں بہنیں کھڑی ہو گئیں۔ عظیم نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
امی! قیصر اور عاصفہ کہاں ہیں۔

ریحانہ نے باہر صحن کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دھوپ میں بیٹھے پڑھ رہے ہیں۔ قیصر عظیم کا چھوٹا بھائی تھا اور ایم۔ بی۔ اے کے آخری سال میں تھا۔ عاصفہ عظیم کی منگیترا اور خالہ زاد تھی۔ اس کے ماں باپ کی رہائش گزیراوالہ میں تھی اور وہ یہاں اپنی خالہ کے ہاں رہ کر ایم۔ ایس۔ سی کر رہی تھی۔

ریحانہ کمرے کے دائیں طرف پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے صوف پر عطیہ اور صائمہ بیٹھ گئیں۔ عظیم ماں کے پاس آ بیٹھا۔ وہ دھیمے دھیمے سکر رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا سر ریحانہ کی گود میں رکھ دیا اور طفلانہ انداز میں کہا۔

امی! آج میں نے پہلی بار ایک حرکت آپ کی اجازت کے بغیر کی ہے۔ آپ

مجھ سے خفا تو نہ ہونگی امی؟ — ریحانہ اس کا سر ہلانے لگی۔ پھر جھک کر عظیم کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

تم جیسے بیٹے سے میں خفا ہو سکتی ہوں؟  
عظیم نے وہ دونوں پکیٹ جو وہ لیکر آیا تھا۔ ریحانہ کی گود میں رکھ دیئے۔  
امی! میں عطیہ اور صائمہ کے لیے کپڑے اور جوتے خرید لایا ہوں۔ ان دونوں کے پاس ایک ایک ہی جوتا ہے اور وہ بھی ٹوٹ رہا ہے۔ ویسے بھی بہت دنوں سے میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اپنی دونوں چھوٹی بہنوں کے لیے خود کوئی چیز خریدوں۔  
ماں! میں نے غلطی تو نہیں کی؟ ریحانہ کی گود میں دوبارہ اس نے سر رکھ دیا تھا۔  
عطیہ رو پڑی تھی اور منہ دوسری طرف پھیر کر سسکنے لگی تھی۔ ریحانہ کی آنکھیں بھی آنسوؤں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے تھیں۔ عظیم نے چونک کر سر اُپر اٹھایا۔ پہلے غور سے عطیہ کی طرف دیکھا پھر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے گھیر آواز اور منموم لہجے میں اس نے پوچھا۔

تم دونوں رو کیوں رہی ہو؟  
ریحانہ نے آنسو پونچھ لیے۔

تم خود ہی تو رلانے والی باتیں کرتے ہو۔ اپنی بہنوں کے لیے کچھ خرید کر لاتے ہو تو میں کیوں خفا ہونگی۔ اللہ کرے قیصر بھی تم جیسا نکلے تو میں سمجھوں گی۔  
میری کو کھٹھنڈی ہو گئی۔ عظیم نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دہرے کیے ہوئے کچھ نوٹ اس نے ماں کی گود میں رکھ دیئے۔



مجھے آج تنخواہ مل گئی ہے امی! کچھ روپے میں دونوں بہنوں کے جوتوں کپڑوں  
 پر خرچ کر دیئے ہیں اور یہ بچے ہیں گن لیں۔  
 دیکھانے روپے لیکر مٹھی میں دبالیے۔ عظیم نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے  
 کہا بھوک لگی ہے امی!  
 عطیہ کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔

بھائی جان! باہر دو بالٹیوں میں پانی گرم ہونے کے لیے رکھا ہے پہلے اٹھ  
 کر نہالیں۔ اتنی دیر تک میں کھانا گرم کر لاتی ہوں۔  
 عظیم قمیض اتارنے لگا۔ دیکھانے اٹھ کر باہر نکل گئی۔ پھر برآمدے سے اس کی  
 آواز سنائی دی۔

عظیم! میں دونوں بالٹیاں غسل خانے میں رکھنے لگی ہوں۔ جلدی آکر نہالو نہیں  
 تو پانی ٹھنڈا ہو جائے گا قمیض گندھے پر ہی رکھے عظیم بھاگتا ہوا باہر آیا اور دونوں  
 بالٹیاں دیکھانے سے اس نے چھین لیں۔ دیکھانے نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھتے  
 ہوئے پوچھا۔

یہ کیا بیٹے؟

عظیم غسل خانے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

کیوں گنہگار کرتی ہیں امی! آپ نے بہت خدمت کی ہے اپنی اولاد کی۔

اب ہمارا کام ہے۔ آپ کی خدمت کریں۔ دیکھانے پیار سے اسے دیکھتی رہ گئی۔  
 اور وہ غسل خانے جا کر نہانے لگا۔



نہا کر تو ایسے سے سر گر گرتا ہوا وہ باہر نکلا تو ڈاکیہ آگیا۔ آصفہ کا منی آرڈر تھا۔  
برائے میں کھڑی عطیہ کو عظیم نے آواز دی۔

عطیہ! عاصفہ سے کہو اپنا منی آرڈر لے لے۔

عاصفہ نے شاید خود ہی سن لیا۔ بھاگتی ہوئی وہ وہاں آئی۔ جلدی جلدی دستخط  
کئے اور منی آرڈر وصول کر لیا۔ ایک ہزار روپیہ تھا۔ عظیم جب وہاں سے مڑنے  
لگا تو عاصفہ نے بڑی ہمدردی سے پوچھا۔

عظیم! تمہیں اگر دوپوں کی ضرورت ہو تو لے لو۔

عظیم تیز تیز قدموں سے سامنے والے کمرے میں چلا گیا۔

مہربانی!

یہ ایک فوجی بارک نما سوبلی تھی جس کا آدھا حصہ عظیم اور آدھا حصہ اس کے  
چچا سعادت کے پاس تھا۔ عظیم کے ابا انجینئر تھے اور چند برس قبل اچانک ایک  
حادثے میں مر گئے تھے۔ عظیم اس وقت میٹرک میں تھا۔ وہ عظیم کو ڈاکٹر بنانا  
چاہتے تھے۔ پر موت نے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی۔ اس کے بعد عظیم  
نے کسی نہ کسی طرح بی۔ اے کر لیا۔ اور اب ایک پرائیویٹ فرم میں وہ معمولی  
کلرک تھا۔

عظیم کے چچا سعادت ڈاکٹر تھے ایک خوش مزاج اور ہمدرد انسان تھے  
ان کی بیوی مرچلی تھی اور اولاد میں صرف ایک لڑکی ہی تھی جس کا نام آسیہ تھا اور  
جو ڈاکٹری کے تیسرے سال میں تھی۔ گھر کے اخراجات اور چھوٹے بھائی کی

پڑھاتی جاری رکھنے کے لیے عظیم کو مروس کے علاوہ پارٹ ٹائم جاب بھی کرنا پڑ رہا تھا۔

کھانے کے بعد عظیم کچھ دیر ماں کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا رہا۔ اس دوران عظیم نے اس کی تیلون قمیض اور کوٹ برش کر دیتے تھے۔ عظیم اٹھا اور کپڑے پہنتے لگا۔ ریحانہ نے بڑی شیفٹی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

عظیم! میں تو کہتی ہوں یہ جزوقتی کام چھوڑ دو۔ صحت خراب ہو جائیگی بیٹے! دن رات کام میں جتے رہتے ہو۔

ماں کی طرف دیکھتے ہوئے عظیم نے بڑی سنجیدگی اور مغموم انداز میں کہا۔  
گھر کے اخراجات چل جائیں گے کیا؟ میری ایک تنخواہ تو قیصر کی پڑھائی پر ہی لگ جاتی ہے۔ پھر اس کی آواز گھری اور گھیر ہو گئی۔ آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہیں امی! اور پھر میری صحت میں کوئی فرق تو نہیں پڑا۔

ریحانہ لا جواب سی ہو کر خاموش ہو گئی۔ عظیم جب باہر نکلنے لگا تو ریحانہ تیزی سے اٹھی اور دس روپے کے دو نوٹ اس کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ سارا دن کام کرتے رہتے ہو کچھ کھاپی بھی لیا کرو۔

عظیم برآمدے سے اتر کر صحن میں ہوتا ہوا جب بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا تو اس کے چچا سعادت نے اسے آواز دی۔ وہ اپنے مکان کے لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ عظیم نے ان کی آواز نہ سنی تھی۔ اتنے میں اس کی چچا زاد بہن آسیہ بھاگتی ہوئی آئی اور زور سے پکارا۔



عظیم بھائی !

عظیم نے مڑھ کر دیکھا — مجھے بلایا آسیہ !

ہاں بھیا ! ابو آپ کو بلا رہے ہیں ۔

دونوں گھروں کے درمیان کوئی دیوار یا پردہ نہ تھا ۔ عظیم وہیں سے مڑھا اور

سعادت کے سامنے کرسی پر آکر بیٹھ گیا ۔ چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے سعادت مسکراتے ہوئے بولے ۔

پارٹ ٹائم جا رہے ہو ؟

جی ہاں ۔ کوئی کام ہو تو کہیے ۔

کام تو کوئی نہیں ۔ بس چائے تیار ہے پیتے جاؤ ۔ اتنے میں آسیہ نے اس کے

سامنے دھواں نکلتی ہوئی چائے کی پیالی لاکر رکھ دی ۔ عظیم خاموشی سے پینے لگا ۔

پیالی خالی کر کے اس نے گھڑی دیکھی اور کھڑا ہو گیا ۔

مجھے اب اجازت دیں انکل — سعادت نے بڑی شفقت سے اس

کی طرف دیکھا ۔ مسکراتے اور گھلاوٹ آمیز لہجے میں کہا ۔

جاؤ بیٹا ! خدا تمہیں اپنی زندگی کے مقصد میں کامیاب کرے ۔ عظیم وہاں

سے ہٹ کر باہر نکل گیا ۔

تیس دسمبر کی وہ تاریک رات تھی ۔ ہر طرف سرد اور ویران اندھیرا پھیلا ہوا

تھا ۔ گھر سے نیلے آسمان سے رات اس کے موتی برسا رہی تھی ۔ پرانا ، کہن اور

بوڑھا سال اپنی آخری رات میں دم توڑ رہا تھا ۔ اور نئے سال کا طفل ابنا سنے



آدم کے دکھوں میں اضافہ کرنے اور ان کے سروں پر پاؤں کو جی کرنے کے لیے اپنے پاؤں میں گھنگھرو باندھ رہا تھا۔

جز وقتی کام سے فارغ ہو کر عظیم سیٹی بجاتا ہوا اپنے گھر داخل ہوا۔ وہ گھر کے بڑے کمرے میں داخل ہونے ہی لگا تھا کہ رک گیا۔ دائیں طرف کے تیسرے کمرے میں اسے کسی کے کھسر پھسر کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ قیصر کا کمرہ تھا۔ عظیم اس دروازے پر آیا اور ایک روزن سے اندر جھانکا۔ اس کا جسم ہٹا گیا۔ اس کا دل یوں دھڑک اٹھا تھا جیسے کسی دیوانے کا ہاتھ اچانک مضرب پر گر گیا ہو۔ اس کا ذہن لاوے کی طرح کھول اٹھا تھا۔ اس کی حالت اس لاش جیسی ہو گئی تھی۔ جسے جتا میں رکھ کر آگ لگا دی گئی ہو۔

اندر قیصر اور عاصف آمنے سامنے کریوں پر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بڑی چاہت اور پیار سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ پھر عظیم کے کانوں میں قیصر کی آواز پڑی۔

ہم دونوں کب تک یوں چوری چوری ملتے رہیں گے۔  
عاصف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تو پھر بات کرو خالہ سے۔

قیصر نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا — تو بہ! تو بہ! میں امی سے کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ میں عاصف سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ تو میرے کھڑے کھڑے گلہ گھونٹ دیں گی۔ وہ کوئی بھی ایسا کام نہیں کرتیں جس میں بھائی جان کی خوشنودی شامل

نہ ہو وہ بھائی جان سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتی ہیں۔

عاصفہ نے جستجو میں پوچھا۔

وہ عظیم کو اتنا کیوں چاہتی ہیں۔

ایک تو بڑا بیٹا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شکل ابو جان سے ملتی ہے سب سے بڑھ کر امی جان کو انکی عادت پسند ہیں کیونکہ امی کی اجازت کے بغیر وہ کوئی کام نہیں کرتے۔ عاصفہ نے قیصر کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھہری سنجیدگی میں کہا۔

دیکھو قیصر! جہاں تک عظیم کی ذات کا تعلق ہے۔ وہ دراز قد، خوبصورت اور

شخصیت میں لا جواب ہے۔ جسمانی لحاظ سے وہ ہر طرح تم سے بالاتر اعلیٰ ہے۔ اور

میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ میں اس سے بے پناہ محبت کرتی رہی ہوں۔ لیکن یہاں اس کے پاس رہتے ہوئے میں نے اس کی ایک خامی پکڑ لی ہے جس کی وجہ سے

میں اس سے دُور ہٹ کر تمہارے قریب آتی ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ کوئی

کام اپنی امی کی رضا مندی کے بغیر نہیں کرتا۔ کل کو میری اور اس کی اگر شادی ہوتی ہے

تو وہ ساری باتیں تو خالہ کی مانے گا۔ ایسی حالت میں میری وقعت اس گھر میں بلازمہ

سے زیادہ نہ ہوگی۔ یاد رکھو اگر تم نے بھی وہی راستہ اختیار کیا تو میں دوبارہ عظیم کی طرف

لوٹ جاؤں گی۔

قیصر نے اس کے بالوں سے کھیلنے ہوئے کہا۔

شادی کے بعد میں ویسے ہی کیا کروں گا جس طرح تم کہو گی۔

تو پھر خالہ سے شادی کی بات کرو۔



یہ کام صرف تم ہی کر سکتی ہو۔

کیسے؟

بس تم اپنی امی سے کہو میں عظیم سے نہیں قیصر سے شادی کرنا چاہتی ہوں وہ امی سے بات کر نیگی ادویوں بات بن جائیگی۔

عظیم اس سے آگے کچھ نہ سن سکا اس پر اعضاء شکنی طاری ہو گئی تھی۔ جان پر آسمان پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس کا بھاتی جو اس کی محنتوں کا ثمر تھا اسے دھوکا دے رہا تھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے اس نے دیوار کا سہارا لے لیا اور اُونچے اُونچے سانس لینے لگا۔ اسے عاصفہ سے محبت جو تھی۔ وہ دیوار سے سہارا لیے کھڑا رہا۔ صحن میں اس سے لڑا ہوا یو کلیٹس کا درخت رو رہا تھا۔ رات خاموش ستارے اداس اور دیوار تک کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے جسم کی ساری اکائیاں منتشر ہونے لگی تھیں۔ قسمت کے اس کھیل پر وہ خشک لکڑی کی طرح ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی حالت ہزاروں سال پُرانے مندر کے شکتہ استھان پر بیٹھے ہوئے چراغ جیسی ہو گئی تھی۔

اس کا بھاتی اس کی ودیعت اس سے چھین رہا تھا۔ وہ اس طوفان زدہ پریشے کی مانند ہو گیا تھا جس کا آشیانہ تیز ہواؤں میں منتشر ہو گیا ہو۔ یا وہ اس شخص کی طرح تھا۔ جسے بے گناہ ہوتے ہوئے بھی دوزخ کے تاریک غاروں میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ اس کی زندگی کا یہ پہلا حادثہ تھا جس نے اسے خدا کا منکر اور ملحد بنانے کی اساس ڈال دی تھی۔



کمرے کے اندر جب کھٹکا ہوا تو وہ سنبھل گیا۔ شاید عاصفہ باہر آنے لگی تھی۔ وہ گرتا پڑتا باتیں طرف مڑھا اور بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ سامنے عطیہ بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی اور اس کے باتیں ریحانہ صائمہ کو اپنی گود میں بٹھاتے پڑھا رہی تھی۔

اتنے میں عظیم آگے بڑھا وہ تینوں چونک پڑیں۔ عظیم بری طرح لڑکھڑاہا تھا۔ قدم رکھتا کہیں تھا اور پڑتے کہیں تھے۔ وہ ہانپ رہا تھا جیسے ایک لمبی مسافت طے کر کے آیا ہو۔ بہک رہا تھا۔ نشہ کرنے والوں کی طرح۔

ریحانہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ صائمہ کو اس نے ایک طرف بٹھایا اور تیزی سے عظیم کی طرف پلکی۔ عطیہ نے بھی کتاب پھینک دی اور پریشانی کی حالت میں عظیم کی طرف بھاگی۔ ریحانہ نے آگے بڑھ کر عظیم کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور روتی ہوئی آواز میں پوچھا کیا ہوا بیٹے!

عظیم ماں کے بازوؤں میں جھول گیا۔ اس کا سر ریحانہ کے سینے پر گر گیا تھا۔ عظیم جس کا قد چھ فٹ کے قریب تھا اور جسم خوب بھرا ہوا تھا۔ جب ریحانہ کے بازوؤں میں جھول گیا تو اس بچاری کی ٹانگیں کپکپا گئیں اور وہ رونے لگی۔ ریحانہ گوجار بچوں کی ماں تھی لیکن جوان تھی۔ چھوٹی عمر میں ہی شادی ہو گئی تھی اور اگر اسے عظیم اور عطیہ کے سامنے کھڑا کر دیا جاتے۔ تو وہ کسی صورت ان کی ماں نہ لگتی تھی۔ اور دیکھنے والا یہی کہے گا۔ ان کی بہن ہے۔ اس کے سر کا ایک بال بھی ابھی سفید نہ تھا۔ اور چہرے پر وہی جوانی کی سُرخی اور تازگی تھی۔ اس کے باوجود وہ عظیم کے بوجھ تلے ڈمکلا گئی

تھی —

عظیم کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے اور آنسو بہاتے ہوتے اس نے کہا —

عظیم! کیا ہوا میرے بچے! سیدھے تو ہو بیٹے!  
 ریحانہ کی چھاتی پر سر رکھے عظیم نے آنسو بہاتے ہوتے کہا۔  
 آپ کا بیٹا بک گیا ہے ماں! میں منتشر ہو گیا ہوں امی!  
 عطیہ جو ابھی تک بُت بنی کھڑی تھی۔ عظیم کی کمر سے لپٹ کر پھٹ پڑی اور  
 بھیا بھیا پکارتی ہوئی وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ صائمہ بھی وہاں بیٹھے بیٹھے رونے  
 لگی تھی۔

عظیم نے ایک بار اپنا چہرہ اُدپر اٹھایا۔ اس کا منہ آنسوؤں میں ڈھلا ہوا تھا اس  
 کے چہرے پر جذباتی ہیجان، دل شکن بے اعتنائی، نا آسودگی اور لامحدود خاموشی کے  
 آثار تھے۔ جیسے وجع القلب کا مریض ہو۔ وہ ویران، پامال، شکستہ اور خستہ حال تھا  
 اس کے چہرے پر پاس و قنوط کی زردی بکھری ہوئی تھی۔ ریحانہ کو یوں لگا جیسے قدرت  
 کی ساری تخلیقی قوتیں ختم ہو گئی ہوں اور اس کا اپنی جان سے عزیز بیٹا زمانے کی  
 لامحدود وسعتوں میں تحلیل ہو کر لمحہ بہ لمحہ اس کی نگاہوں سے دُور ہوتا جا رہا ہو۔  
 ریحانہ اس کی حالت دیکھ کر پاگل ہو گئی اور اس کا منہ چومتے ہوتے پوچھا۔  
 کیا ہو گیا میرے بچے کو؟ کس منحوس کی نظر لگ گئی ہے۔ وہ رو بھی رہی تھی اور  
 عظیم کا منہ بھی چوستی جا رہی تھی۔ عظیم نے ایک ہاتھ ریحانہ کی گردن کے گرد اور



دوسرا عطیہ کے گلے میں ڈال کر اس نے دونوں ماں بہن کو زور سے پٹاتے ہوئے  
کچلے کچلے اور دبے دبے لہجے میں پوچھا۔

کیا ہوا آپ دونوں کو میں تو ————— اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔  
عطیہ نے روتے روتے کہا۔

آپ کو کچھ ہو گیا ہے بھیا! ہم دونوں ماں بیٹی تو دیکھو ٹھیک ہیں — صائمہ  
ابھی تک بھیا بھیا کہتی ہوئی روتی رہی تھی۔

اتنے میں قیصر اور عاصفہ بھاگتے ہوئے اندر آتے عطیہ نے قیصر کی طرف  
دیکھتے ہوئے اور زیادہ زور سے روتے ہوئے کہا۔

بھیا دیکھو بھائی جان کو کیا ہو گیا ہے۔

عاصفہ غلیم کے قریب کھڑی ہو کر پریشانی سے یہ منظر دیکھنے لگی۔ قیصر آگے بڑھا  
اور غلیم سے لپٹ گیا۔

کیا ہوا بھیا!

غلیم نے ترچہ پی نگاہوں سے اسے دیکھا — کچھ نہیں۔

اسی وقت سعادت بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ سخت

بدحواس تھے ان کے پیچھے پیچھے آسہ بھی تھی۔ سعادت نے آتے ہی گہرا آئے ہوئے  
لہجے میں پوچھا۔

بھابی! کیا بات ہے۔ تم لوگ رو کیوں رہے ہیں۔

دیکھنا اور زیادہ کھل کر رونے لگی۔



بھیا! غلیم کو دیکھیں کیا ہوا ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤنگی وہ  
بچاری پلنگ پر گر کر سر پیٹنے لگی۔ عطیہ اور صائمہ اسی طرح رو رہی تھیں۔ آسیہ نے  
آگے بڑھ کر ریحانہ کو سنبھالا۔

صبر کرین آنٹی۔ اپنے آپ کو سنبھالیں۔ کچھ نہیں ہوا بھائی جان کو۔ ٹھیک ہیں  
۔۔۔ ریحانہ کے پاس سے ہٹ کر آسیہ غلیم کی طرف بڑھی اور اس کے سامنے  
کھڑے ہو کر اسے کے شانے دبائے گئی۔

سعادت نے سب کو پیچھے ہٹایا۔ غلیم کو انہوں نے اپنے ساتھ لٹایا اور  
پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

کیا ہوا میرے بیٹے کو؟

غلیم کی آواز کپکپا رہی تھی۔ انکل! — وہ — وہ — دیکھیں نا  
سعادت نے اس کی پیشانی پر پیار کیا — تمہیں یہ اچانک کیا ہو گیا ہے بیٹے۔  
غلیم اب کچھ کچھ سنبھلنے لگا تھا۔ اس نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ پھر اس کے  
بدن نے ایک جھرجھری لی اور وہ سنبھل گیا۔ اصل بات کو اس نے اپنے سینے میں  
لاوے کی طرح پتیا اور سلگتا ہوا راز ہی رہنے دیا اور فوراً بہانہ تراش لیا۔

انکل! میں گھر آ رہا تھا کہ ٹرک پر ایک بچی ٹرک تلے آکر مر گئی۔ وہ بالکل ہماری  
بے بی جیسی تھی۔ اس حادثے سے میرے حواس جاتے رہے اور میری یہ حالت  
ہو گئی۔ وہ رک گیا۔ سعادت نے اس کا سر اپنے سینے سے لگایا۔

واہ بیٹے! اتنی سی بات تھی۔ ذرا ماں اور بہنوں کی حالت دیکھو رور و کر باگل

ہو رہی ہیں۔ عظیم ماں کی طرف بڑھا وہ بیٹھی رو رہی تھی۔ عظیم نے اس کے گلے میں بازو ڈال دیئے اور شابانہ و طفلانہ معصومیت سے کہا۔

امی کھانا دیں نا۔ پھوک لگی ہے۔ عظیم کی اس حرکت پر سب مسکرائے لگے۔ ریحانہ نے آنسو بہاتی آنکھوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے عظیم کی طرف دیکھا پھر کھانا لانے باہر نکل گئی۔

عظیم نے پہلے عطیہ کو نبھالا۔ پھر صائمہ کے پاس آیا جسے آسیہ نے اٹھا رکھا تھا۔ عظیم نے صائمہ کو اٹھایا اور اسے لیکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ عائمہ نے اس کی چھاتی پر سر رکھ دیا اور بھولے پن سے کہا۔

بھیا! تم رو کیوں رہے تھے؟

عظیم نے اس کے بال چوم لیے۔ میں تو ٹھیک ہوں بے بی۔ اس نے جیب سے چوڑی لکڑی نکال کر بے بی کو دیئے اور وہ خاموش ہو گئی۔ ریحانہ کھانا لے آتی اور اس کے سامنے تپائی پر لگا دیا۔ کھانا کھانے کو اس کا جی نہ چاہ رہا تھا۔ تاہم ماں کا دل رکھنے کی خاطر وہ تیزی سے لقمے توڑنے لگا۔ سب لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ کمرے میں عظیم کے پاس صرف ریحانہ، عطیہ اور بے بی رہ گئے تھے۔

عظیم نے ماں کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ مگر وہ ابھی تک فکر مند تھی۔ اس کے دل میں ایک گرہ سی بندھ گئی تھی۔ اس کا چہرہ تباہ تھا۔ عظیم کے تراشے ہوئے جھوٹ سے وہ مطمئن نہیں ہے۔

رات حسب معمول بے بی عظیم کے پاس ہی سو گئی تھی۔ جبکہ عظیم بے چینی سے



کر دیں بدل رہا تھا۔ اس کا ذہن چھوٹے بھائی کے منافقانہ اور خناسانہ رویے میں اُلجھا ہوا تھا۔ اس کی محبت کے سارے سچتہ عہد ریت کے گھر وندوں کی طرح اس پر گر کر بکھر گئے تھے۔ چھوٹا بھائی جسے وہ اپنا خون و کیر پال رہا تھا۔ اس کے لیے آستین کا سانپ جو بن گیا تھا۔ اور تقدیر کے اس بل نے اسے کانسج کے کھلونے کی طرح توڑ دیا تھا۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ سب لوگ ناشتہ کر چکے تھے۔ چھٹی ہونے کی وجہ سے ریحانہ نے اسے جگایا نہ تھا اور وہ عطیہ کے ساتھ گھر کے دھندوں میں لگ گئی تھی۔ عظیم جب کافی دیر تک نہ اُٹھا تو ریحانہ اندر آئی۔ صائمہ جاگ رہی تھی اور عظیم کی قمیض کے ٹبنوں سے کھیل رہی تھی۔ ریحانہ نے بڑے پیار سے عظیم کے گال کو ہاتھ دکھ کر اسے تھپتھپایا۔ اس کا دل دہل گیا۔ عظیم کا جسم گرم تھا اور سجا رہا تھا۔ ریحانہ کا چہرہ اتر گیا۔ عظیم نے آنکھیں کھولیں اور ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ ریحانہ نے سمجھی ہوتی آواز میں کہا۔

عظیم! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟  
عظیم نے آہستہ آہستہ آنکھیں جھپکائیں۔

امی! — میں — مجھے — وہ کچھ کہہ نہ سکا اور  
ماں کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ آنسو پیتے ہوئے ریحانہ نے پوچھا۔  
کسی نے تمہاری دل شکنی کی ہے بیٹے!  
عظیم نے اپنا ایک بازو ماں کے گلے میں ڈال دیا۔



نہیں امی! ایسی کوئی بات نہیں۔  
رہجانہ رو پڑی۔

پھر رات ہی رات میں تمہارا ذرا سامنہ کیوں نکل آیا ہے؟  
عظیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ امی میں باہر دھوپ میں بیٹھوں گا۔  
رہجانہ نے اس کے سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

پہلے میری بات کا جواب دو عظیم۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کس نے تمہیں دکھ  
دیا ہے۔ کون ہے وہ شقی جس نے میرے بیٹے کو ایسا چرکا لگایا ہے۔ میں تمہاری  
ماں ہوں بیٹے۔ مجھ سے تو پردہ نہ رکھو۔ بس ایک بار مجھے یہ بتا دو۔ تمہیں کیا ہوا ہے  
عظیم رہجانہ کے گلے میں جمبول گیا۔

کچھ بھی تو نہیں امی! آپ یونہی دہم کر رہی ہیں۔

اتنے میں عطیہ اندر آئی اور عظیم سے پوچھا۔ ناشتہ لاؤں بھائی جان!  
عظیم چپ سی رہا۔ لیکن رہجانہ نے عطیہ سے ناشتہ لانے کو کہہ دیا اور عطیہ  
باہر نکل گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ لوٹی۔ اس کے ہاتھ میں چمچی، دوسرے میں پانی  
کا لٹا اور کندھے پر تولیہ تھا۔ عطیہ نے عظیم کا منہ ہاتھ وہیں دھلایا۔ عظیم تو لیے سے  
ہاتھ منہ پونچھنے لگا اور عطیہ نے میز کھینچ کر اس کے سامنے ناشتہ لگا دیا۔

رہجانہ کی طرف دیکھتے ہی عظیم نے دکھتے ہجے میں کہا۔ دل نہیں کرتا ناشتہ  
کو امی! رہجانہ نے جھک کر اس کی گردن چوم لی۔ کھالو بیٹے۔ ذات بھی تم نے کچھ نہ کھایا  
تھا وہ عظیم کے پاس بیٹھ کر اپنے ہاتھ سے اسے کھلانے لگی۔

ناشتے کے بعد اس نے چائے پی اور اٹھ کر باہر آ گیا۔ عطیہ نے یو کلیٹس کے تنے کے ساتھ دھوپ میں کرسی لگا دی اور وہ وہاں بیٹھ گیا۔ قیصر بھی وہاں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ غلیم کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھ لیا۔

اب کیسی طبیعت ہے بھائی جان۔

نیچی سی آواز میں اس نے جواب دیا — ٹھیک ہوں۔

اسی لمحہ باہر رکشہ رکنے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر ان کے دیکھتے ہی دیکھتے عاصفہ رکشے سے اتر کر مکان میں داخل ہوئی وہ ایک ہاتھ میں پرس اور دوسرے میں بڑا سا ایک بنڈل اٹھاتے ہوئے تھی۔ شاید بازار سے لوٹ رہی تھی۔ پہلے وہ اپنے کمرے میں گئی۔ پرس دکھ کر لوٹی۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا وہ بنڈل کھولا۔ پھر وہ لان میں آئی اور کپڑے کے دوپیس اس بنڈل سے نکال کر اس نے قیصر کی گود میں رکھ دیئے۔

یہ تمہاری تیلون اور شرٹ کا کپڑا ہے۔ سلا لینا۔ پھر وہ غلیم کے پاس آئی اور ویسے ہی دوپیس اس نے غلیم کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔  
یہ آپ کے ہیں۔

غلیم نے فوراً کپڑے عاصفہ کو لوٹاتے ہوئے کہا۔  
یہ بھی قیصر کو دے دو۔ اس نے بڑے دکھ سے کہا تھا۔

عاصفہ نے تیز نگاہوں سے اسے دیکھا — کیوں؟  
یہ کپڑے اب اسے ہی اچھے لگتے ہیں۔ اس کی آواز میں معاندانہ کھنک



تھی۔ عاصفہ پانی پانی ہو گئی۔ اس کا منہ بند ہو گیا تھا۔ شاید دل کا چور پکڑا گیا تھا۔  
شرمندہ سی ہو کر وہ بولی۔

پر یہ کپڑے تو میں نے آپ کے لیے خریدے ہیں۔  
ایک سخت جھٹکے کے ساتھ عظیم نے عاصفہ کے ہاتھ سے کپڑے چھین لیے۔  
اور اٹھ کھڑا ہوا۔ آہستہ آہستہ چلتا وہ قیصر کے پاس آیا اور اپنے کپڑے بھی اس  
کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

یہ بھی لے لو قیصر!

ریحانہ جو ابھی تک یہ سارا منظر خاموشی سے دیکھتی رہی تھی۔ غصے میں چلائی  
ہوتی بولی یہ کپڑے تمہارے ہیں عظیم! قیصر نے اپنے لیے تو لیے ہیں۔  
عظیم پیچھے ہٹ گیا اور گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

میں نے کیا کرنے ہیں امی! یہ پڑھ رہا ہے اسے کپڑوں کی ضرورت ہے۔  
میرے پاس پہلے ہی کافی کپڑے ہیں۔  
ریحانہ نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا۔  
عظیم! ادھر میرے پاس آؤ۔

عظیم آہستہ آہستہ چلتا ریحانہ کے پاس آیا اور گردن جھکا کر اس کے سامنے  
کھڑا ہو گیا۔ قبل اس کے ریحانہ اسے اور ڈانٹتی اور خفا ہوتی، عظیم کی آنکھوں  
سے دو آنسو نکل کر ریحانہ کے پاؤں پر گر گئے۔ وہ بچاری تحلیل ہو کر رہ گئی اور سارا  
غصہ عظیم کی حالت دیکھ کر پل میں جاتا رہا۔



عظیم نے اپنے سر کو جھٹکا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں ذرا باہر  
جاؤں گا۔ امی میں کپڑے بدل لوں۔ ریحانہ اپنی جگہ پر گم سم کھڑی رہی۔ اسے  
عظیم کو روکنے کی جرات نہ ہو سکی۔ اور عظیم تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے  
کمرے میں چلا گیا۔

---

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : [www.iqbalkalmati.blogspot.com](http://www.iqbalkalmati.blogspot.com)

بات بات پر بہن بھائیوں میں بیٹھ کر قہقہے لگانے والا عظیم بچہ سا گیا تھا اس  
اندھی شمع کی مانند جو کسی کو دیکھے بغیر اپنی ہی روح کو جلاتی بھاتی رہتی ہے۔ اس نے  
چپ سا دھلی تھی۔ پیستے اور تنہا صبح کی طرح وہ ناامیدی، ثرولیدہ حالی، وحشت  
مضبب زندگی اور قسوت کا شکار ہو گیا تھا۔ حالات نے اسے کچل کر بنجر نہ مین  
اور جھڑیری کی تیلیوں سے بنے ہوئے اس قفس کی طرح ادا اس کر دیا تھا جس کے  
اند کوئی پرندہ پنچھی نہ ہو۔ ذہنی مفلسی کے جاذبے وہ اپنی ذات میں گم ہو کر رہ  
گیا تھا۔ بالکل سمندر میں آزادانہ کف اڑاتی ہوئی ان موجوں کی طرح جو سمندر سے  
بکھر کر کنارے کی خشک ریت میں جذب ہو کر ہمیشہ کے لیے اپنا وجود کھو چکی  
ہوں۔ صرف ماں اور عطیہ کا دل رکھنے کی خاطر وہ ان کے پاس گھڑی دو گھڑی بیٹھ  
کر باتیں کر لیتا تھا۔ ورنہ اس نے اپنے آپ کو مٹا کر رکھ دیا تھا۔

دیکھانے سے بہت کریدا، عطیہ نے خوب جھنجھوڑا۔ سعادت اور آسیہ نے بھی خوب کھنگالہ پر اس نے محسوس کے سامنے وہ راز نہ اگلا جو اسے زنگ اور گھن کی طرح چاٹنے لگ گیا تھا۔ بس اندر ہی اندر وہ پتا، کڑھتا اور مچکتا رہا۔ اس کی صحت بھی اب گرتی جا رہی تھی۔ قیصر اور عاصفہ اس کے سامنے آتے ہوتے اب خوف کھانے لگے تھے۔

ایک روز وہ تھکا تھکا سا گھر داخل ہوا۔ اور اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھ کر بوٹ اتارنے لگا۔ دیکھانہ اور عطیہ دونوں اس کے سامنے صوفہ پر آکر بیٹھ گئیں اور بڑی حسرت سے اسے دیکھنے لگیں۔ بوٹ اتار کر اس نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔ اور چھت کو گونے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ دیکھانہ بیتاب ہو کر اٹھی اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

خیریت تو ہے میرے بیٹے!

وہ سنبھل گیا۔ ٹھیک ہوں امی! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں بیٹھ جائیے اس نے سامنے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ دیکھانہ پریشان ہو گئی تھی اور چپ چاپ پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ عظیم نے اپنی کرسی آگے کھینچ لی۔

پاؤں اوپر کر لیجئے امی!

دیکھانہ نے پاؤں اوپر کرتے ہوئے دل شکن آواز میں کہا۔ کوئی خیر کی خبر سنانا بیٹے! دیکھانہ رو پڑنے والی تھی۔

میں کراچی جانا چاہتا ہوں امی!



رہجانہ پگل گئی۔ کیوں؟

مجھے وہاں ایک اچھی سی سروس مل رہی ہے۔ محلے کا ایک اور لڑکا بھی جا رہا ہے اسے بھی وہاں سروس ملی ہے۔ میرا ارادہ ہے میں اس کے ساتھ ہی چلا جاؤں۔ اس کے وہاں کچھ دوست رہتے ہیں۔ اس طرح میں رہائش کی تلاش سے بچ جاؤں گا۔

رہجانہ نے اپنا فیصلہ دیا۔

نہیں بیٹے۔ یہی سروس ٹھیک ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے تو ہونا۔  
عظیم نے رہجانہ کے پاؤں پکڑ لیے۔

امی! کیا آپ میری بات نہ مانے گی؟

رہجانہ نے سختی سے ڈھانٹ دیا۔

تم کہیں نہیں جاؤ گے عظیم۔ یہ میرا حکم ہے۔ اس بد نصیب ماں کا حکم جس کا کہنا تم نے آج تک کبھی نہیں ٹالا۔ پھر رہجانہ کھل کر رو پڑی اور ہچکیوں میں کہا۔ اگر ہم سب ساتنی ہی نفرت۔ ہو گئی ہے تو سب کا گلہ گھونٹ دو اور جدھر جی چاہے نکل جاؤ۔

عظیم نے بڑے دکھ سے کہا۔

کیا آپ بھی میرا کہنا نہ مانے گی امی!

رہجانہ بچا رہی چھلنی ہو رہی تھی۔ دکھتی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔

میں پہلے ہی تمہاری چپ اور اسی سے جلی بیٹھی ہوں عظیم اب اور آگ نہ لگاؤ

عظیم نے دیکھنے کے پاؤں پر اپنا منہ رکھ دیا اور ماں کے پاؤں کے تلے اپنے ہونٹوں سے چومتے ہوئے کہا۔

بچے اُمید ہے آپ مجھے مایوس نہیں کریں گی۔

دیکھنا غصے میں بل کھاتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے عظیم عظیم بھی کھڑا ہو گیا اور سر جھکا کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

یہ جگت اور سناہ ہی ظالم ہے امی! کسی کا کوئی دوست نہیں۔ آپ کی آتما ٹھنڈی رہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں یہاں رہ کر موم بتی کی طرح پگھل پگھل کر جان دے دوں۔ اگر آپ پسند کرتی ہیں کہ میری روح کو میرے جسم سے نفرت ہو جائے اور میرے اجزائے ہستی بکھر جائیں تو یوں ہی امی! میں سمجھونگا۔ میں نے اپنی زندگی کے امتداد کو سیٹ کر اپنا آپ اپنی ماں پر قربان کر دیا ہے۔ امی! اگر آپ کی خوشی میری قربانی مانگتی ہے تو خدا کی قسم آپ دیکھیں گی۔ میں اپنی ماں کی خوشنودی کے لیے ثابت قدم رہوں گا۔

عطیہ اپنی جگہ پر بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ دیکھنا آگے بڑھی اور عظیم کو لپٹاتے ہوئے اس نے دندھی ہوتی آواز میں کہا۔

جو تم کہو گے۔ وہی ہوگا۔ پھر وہ تیزی سے باہر نکل گئی اور سعادت کے ماں داخل ہوئی وہ دونوں باپ بیٹی بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ دیکھنا اندر داخل ہوئی۔ سعادت کھڑے ہو کے بولے۔

آیتہ بھابی!



ریمانہ آگے بڑھ کر آسہ کے پاس بیٹھ گئی اور گلو گھر لہجے میں کہا۔

ایک نئی مصیبت آن پڑی بھیا۔

سعادت گھبرا گئے۔ کیا؟

عظیم کراچی جانا چاہتا ہے۔

کیوں؟

کہتا ہے وہاں ایک اچھی سروس مل رہی ہے۔ پر میرا دل نہیں مانتا بھاتی

جان! وہ صرف یہاں سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کسی نے میرے بیٹے کو کچل کر رکھ دیا ہے۔

جانے دو بھابی! شاید ماحول بدلنے سے سنبھل جائے۔

ریمانہ رو پڑی۔ کیسے جانے دو بھاتی جان! یہاں تو میری نگاہوں کے

سامنے ہے۔ زبردستی کھانا کھلاتی ہوں۔ وہاں اکیلا ہوگا۔ کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔

وہاں اپنے آپ کے خلاف اس نے کچھ کر لیا تو پھر کیا ہوگا۔ کیا میں پھر جی سکونگی۔

آپ جانتے ہیں۔ عظیم ہی میری زندگی، میرا جان اور میری روح ہے۔

سعادت گھری سوچوں میں کھو گئے۔ پھر انہوں نے اپنا سر آہستہ آہستہ اوپر

اٹھاتے ہوئے کہا۔ تم اسے جانے دو بھابی! وہ ایک عقلمند اور سیانا لڑکا ہے وہ

کوئی بھی غلط قدم نہ اٹھائیگا۔ میری نسبت تم اسے بہتر جانتی ہو۔ کیا تمہیں اس سے

ایسی امید ہے۔ ہاں دکھ تو اس بات کا ہے۔ خبر نہیں کس نے اس کا دل دکھایا ہے

میں کئی روز سے یہی سوچ رہا ہوں۔

دیکھانے نے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ وہ بہت حساس لڑکا ہے۔ بھائی جان۔ کسی نے اسے بہت بڑا گھاؤ اور چرکا لگایا ہے۔ روز بروز بھٹتا جا رہا ہے۔

اب اس سے نمٹنا فضول ہے۔ بھابی۔ تم جانے دو اسے۔ اوروں کا تم قیصر سے تو بات کر۔ شاید عظیم کا اس سے ہی کوئی جھگڑا ہوا ہو۔ میں کئی روز سے دیکھ رہا ہوں وہ عظیم سے دور دور رہتا ہے۔

دیکھانے بھل کھا کر کھڑی ہوئی۔ باہر نکلی اور تیز تیز چلتی ہوئی اندھی اور طوفان کی طرح وہ قیصر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ قیصر پڑھ رہا تھا۔ ماں کو اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گیا اور کھڑا ہو گیا۔

امی جان! خیریت ہے نا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔  
دیکھانے نے اسے گھما جانے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ تم نے عظیم سے کچھ کہا ہے؟ کیا تمہارا اس سے کسی بات پر جھگڑا ہوا ہے؟  
قیصر کانپ گیا۔ نہیں تو امی جان!

دیکھانے سادہ بھادوں کے موٹا دار مینہ اور اوروں کی طرح برس پڑی پھر وہ یہاں سے کیوں بھاگ رہا ہے۔ کیوں!۔۔۔ ہم سب سے نفرت ہو گئی ہے۔ اس نے چپ کیوں سادھ لی ہے۔ وہ بچہ کیوں گیا ہے۔ وہ دن کو مجاہدہ اور رات کو بیداری کرنے والوں کی طرح اپنی ہی زندگی سے تھک کیوں چکا ہے۔ گھر کے بسرام اوروں کی محبت کو کیوں لات مار رہا ہے۔ کیوں اس کی آنکھیں پتھر اگتی ہیں۔



کیوں اس کے چہرے پر وحشی جلال آگیا ہے۔ اور کس لیے وہ اپنی زندگی کی آخری  
سرحدوں کو بھاگنے لگا ہے۔

دیکھ نہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بات بات پر قہقہے لگانے والا میرا عظیم  
کجاں کھو گیا ہے۔

قیصر نے آگے بڑھ کر ماں کو سنبھال لیا۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ امی جان!

ریحانہ دور رہی تھی۔  
تم عظیم سے بائبل بے تعلق ہو گئے ہو۔ اسے کسی نے کچل دیا ہے اور تم نے  
اس سے کبھی پوچھا نہیں۔ اس گھر کو سنبھالنے والا ہی ہل گیا ہے۔ اس گھر کے ستون  
کو ہی گھن لگ گیا ہے۔

آہ! اس گھر کے در و دیوار کی بنیادیں جواب دے رہی ہیں۔ کیا ہونے والا  
ہے۔ میرے اللہ خیریت رکھو! قیصر ریحانہ کے سامنے مجرموں کی طرح کھڑا تھا  
ریحانہ جب دوسرے کمرے میں داخل ہوتی تو عظیم کھانا کھا چکا تھا اور عطیہ  
اس کے ہاتھ دھلا رہی تھی۔ قریب ہی صائمہ بیٹھی ہوتی تھی۔ ریحانہ عظیم سے قریب  
ہوتی ہوتی بولی۔

تم ضرور کراچی جانا چاہتے ہو بیٹے!  
عظیم کھڑا ہو گیا۔ میں نے آپ سے کبھی مذاق بھی کیا ہے امی!  
کیا کیا ساتھ بجاؤ گے؟  
عظیم بھاگ کر ریحانہ سے پیٹ گیا۔ او میری اچھی امی!

ساتھ کیا کیا ایجاد گئے ؟

بس ایک بستر اور زیادہ سے زیادہ دو چار جوڑے کھڑے۔  
 ریکانہ نے اسے ایسی نگاہوں سے دیکھا جن میں شکایت ہی شکایت اور  
 شکوہ ہی شکوہ تھا۔ عظیم ماں کی جلتی ہوئی آنکھوں کی تاب نہ لا سکا اور ایک طرف  
 ہٹ گیا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ ریکانہ کچھ دیر تک کمرے کے اندر  
 کھڑی رہی پھر وہ بھی عظیم کے پیچھے پیچھے باہر نکل گئی۔  
 ریکانہ نے دیکھا عظیم دائیں طرف قیصر کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ریکانہ  
 کو شبہ ہوا وہ بھی اس کمرے کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی اور دونوں بھائیوں کی  
 بات چیت سننے لگی۔

عظیم کو اپنے کمرے میں دیکھتے ہی قیصر کھڑا ہو گیا۔ وہ رعشے کے مریض کی طرح  
 سر سے پاؤں تک کانپ گیا تھا۔ عظیم اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر دروازے  
 پر کھڑی ریکانہ کے کان میں عظیم کی آواز پڑی۔  
 بیٹھ جاؤ۔

قیصر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر کئی اجنبی رنگ تیزی سے آمد و رفت کر رہے  
 تھے عظیم کی سنجیدہ آواز پھر ابھری۔  
 میں کل کراچی جا رہا ہوں قیصر !  
 امی مجھے بتا چکی ہیں۔

میرے بعد امی، عطیہ اور بے بی کا خیال رکھنا۔ تمہیں پتہ ہے ہمارے سر



پر باپ کا سایہ نہیں ہے۔ ہم دونوں بھاتی ہی ان تینوں کے لیے سب کچھ ہیں۔  
میرے بعد امی کو محسوس نہ ہو کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ یاد رکھو وہ ایک ایسی ماں  
ہیں جو بہت کم بیٹوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ میں مجبوری کے تحت کراچی جا رہا ہوں۔  
ورنہ عظیم میں اتنی جرات نہیں کہ وہ اپنی امی کے قدموں سے دور ہو۔ امی سے  
جدا ہونے کے خیال سے میرے دل پر ابھی سے طوفان چل نکلے ہیں۔

بے بی بات بات پر ضد کرے گی۔ اس کا دل نہ دکھانا۔ عظیمہ ہماری جوان  
بہن ہے۔ اس کی ہر بات ماننا۔ وہ ایک عقلمند اور سلجھی ہوتی بہن ہے۔ وہ کسی کو  
شکایت کا موقع ہی نہیں دیتی۔

میں ہر ماہ روپے بھیجا کروں گا۔ تم دل لگا کر پڑھنا۔ اب امی کی ساری امیدیں  
تم سے وابستہ ہیں۔ میں نے جو کچھ بننا تھا بن چکا ہوں۔ تم محنت کر کے اپنا مستقبل سنوار  
لو۔ آج جس شخص کے پاس چار پیسے نہ ہوں اسے کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ میں تم میں  
سے کسی کو نہ بھولوں گا۔ میں جہاں بھی ہوں گا۔ مجھے یہ احساس ہو گا کہ میں ایک بیوہ ماں  
کا سہارا ہوں اور مجھے ایک جوان بہن اور بھاتی کی شادی کرنا ہے۔

قیصر کا سر جھکا ہوا تھا۔ آپ فکر نہ کریں بھاتی جان میں آپ کو شکایت کا موقع نہ  
دوں گا عظیمہ کھڑا ہو گیا اور قیصر کی پیٹھ تھپتھپاتی۔

شاباش تم بہت اچھے بھاتی ہو۔

پھر وہ دروازے کی طرف مڑ گیا۔ پر ابھی دو قدم ہی بڑھا تھا کہ واپس مڑتا

ہوا اس بار بڑی زہریلی آواز میں بولا۔

اور ہاں عاصفہ کا بھی خیال رکھنا۔

قیصر کو یوں محسوس ہوا جیسے عظیم نے اس کے منہ میں پٹر مار کر ڈھیروں کاٹ لیا اس کے منہ پر مل دی ہو۔ عظیم تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازے پر دیکھا کہ کوئی دیکھ کر عظیم چونک پڑا۔

امی! آپ یہاں؟

ریحانہ نے آگے بڑھ کر عظیم کی پیشانی چوم لی۔

میرے بیٹے! میرے بچے! تمہارا نام بھی عظیم ہے اور تم ہو بھی عظیم۔  
دوسرے روز صبح ہی صبح عظیم کے جانے کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔  
وہ صرف ایک بستر اور دو جوڑے کپڑے لیجانے پر بے بند تھا۔ لیکن ریحانہ نے  
ڈانٹ ڈپٹ کر اس کے اٹیچی میں ڈھیروں کپڑے بھر دیئے تھے اور ساتھ ایک  
بستر بھی باندھ دیا تھا۔

شیش پر کھڑے کھڑے ریحانہ کا دل رو رہا تھا۔ وہ کٹکی باندھے اس عظیم کو  
دیکھتے جا رہی تھی جس نے تھوڑی دیر بعد اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جانا تھا۔ علیہ  
اور آسیہ کی آنکھیں جھگی ہوئی تھیں۔ قیصر اور عاصفہ کے جذبات کا انداز لگانا مشکل  
تھا۔ بظاہر وہ دونوں نارمل دکھائی دے رہے تھے۔

جب گاڑی پلیٹ فارم پر آکھڑی ہوئی تو سعادت عظیم کو پکڑ کر ایک طرف  
لے گئے اور بڑے پیار سے کہا۔

بیٹے! باہر جا کر یہ نہ بھولنا تم ایک بیوہ ماں کے سہارے ہو۔ وہ جس طرح



تہیں بھجوا رہی ہے میں جانتا ہوں۔ اس بچاری کا دل رو رہا ہے۔ جاتے ہی اپنی خیریت کا خط لکھتا اور یہ بھی اطلاع دینا کہ سرکس ملی ہے یا نہیں۔ ہم سب تمہارے خط کا بڑی بیباکی سے انتظار کریں گے۔

خلیم کا سر جھک گیا اور غمزہ آواز میں اُس نے کہا۔  
آپ فکر نہ کریں انکل! میں باہر جا کر اپنی اوقات نہ بھونکوں گا۔ میں آپ میں سے کسی کو بھی ہالوس نہ کروں گا۔

سعادت نے اسے گلے لگایا۔ تم بڑے اچھے بیٹے ہو۔ اب وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ سب سے مل لو۔ جب وہ علیحدہ ہوتے سعادت نے اپنی جیب سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر خلیم کی جیب میں ڈال دیئے۔ یہ رکھ لو تمہارے کام آئیں گے۔ خلیم نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

میرے پاس کافی روپے ہیں انکل۔ اس کے علاوہ تین سو روپیہ امی نے دے دیا ہے۔ آپ رہنے دیں۔ سعادت نے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔

اچھے بیٹے حند نہیں کرتے۔ اب جاؤ امی سے ملو جا کر۔  
خلیم ریحانہ کے پاس آیا۔ وہ بچاری پاگلوں کی طرح اسے چومنے لگی۔ خلیم اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔

امی! میری بات سنئے!

ایک طرف ہٹ کر اس نے حاصد سے اپنی منگنی کی انگوٹھی اتاری اور ریحانہ کو تھماتے ہوئے کہا۔

یہ سنبھال کر رکھ لیں امی !

دیکھانہ پریشان ہو گئی۔

یہ بڑا شگون ہے۔ بیٹے ! انگوٹھی پہنے رہو۔

نہیں امی ! باہر مجھ سے یہ گم ہو جائے گی۔

گم ہو جائے گی تو جہنم میں جائے میں اور بنوا دوں گی اپنے بیٹے کو

عظیم نے ضد کرتے ہوئے کہا۔ آپ رکھ لیں نا امی !

دیکھانہ نے چپ چاپ انگوٹھی اپنی مٹھی میں دبالی۔ بیٹے کے جدا ہونے کے موقع پر وہ کوئی نئی بات کھڑی نہ کرنا چاہتی تھی۔ دیکھانہ اسے لیکر اس جگہ آئی جہاں عطیہ اور آسیہ کھڑی تھیں۔ عطیہ نے بے بی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ عظیم نے پہلے جی بھر کر بے بی کو پیار کیا پھر اس نے عطیہ کے کان میں کہا۔

میرے بعد امی کا خیال رکھنا عطیہ ! یہی سمجھ کر کہ میرے بعد تم ان کی بیٹی نہیں ان کا عظیم ہو۔ عطیہ بچاری ہونٹ کاٹتی ہو دوپٹری تھی۔ دیکھانہ اور آسیہ دونوں بہن بھائی کو پریشانی سے دیکھ رہی تھیں۔ عظیم نے پھر عطیہ سے کہا۔

میرے خطوں کا جواب جلدی دینا۔ امی کو کبھی فرصت نہیں بھی ہوتی مگر تم باقاعدگی سے خط لکھنا۔ بے بی کا بھی خیال رکھنا۔

عتیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

آپ بے فکر رہیں بھیتا ! آپ کی بہن آپ کو مایوس نہیں کریگی۔ جب تک آپ ہمارے سر پر ہیں۔ ہمیں کوئی فکر نہیں۔

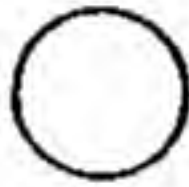


عظیم پیچھے ہٹا اور پیار سے آسیہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اچھا آسیہ خدا حافظ۔ آسیہ بچاری منہ سے تو کچھ نہ کہہ سکی صرف اپنے آنسو پونچھ کر رہ گئی۔ اس کے بعد عظیم قیصر اور عاصفہ سے ملا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

یٹیاں سجیں۔ گاڑی نے مارن دیا اور روانہ ہو گئی۔ سب لوگ پلیٹ فارم پر ادرس کھڑے تھے۔ گاڑی جب نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی دیکھانے والے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے دُکھتے لہجے میں کہا۔

یا اللہ! میرا بیٹا خیریت سے لوٹے۔ میرے بچے کی خیر ہو میرے مولیٰ۔ تو ہی اس کا حامی و ناصر ہے۔ اسی طرح کی دعائیں دیتی ہوتی دیکھانے والے سب کے ساتھ پلیٹ فارم سے باہر نکل گئی۔

---



عظیم تفتہ دل اور سوختہ جگر کے ساتھ ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ محلے کا ایک لڑکا بھیل بھی تھا جس کے کراچی میں کچھ جاننے والے تھے اور وہ بھی روزگار کی تلاش میں کراچی جا رہا تھا۔ عظیم نے بھی ماں سے جھوٹ کہا تھا۔ اسے کراچی میں کوئی سروس نہ ملی تھی۔ وہ صرف گھر کے زندہ اور صحرا دیاباں جیسے ماحول سے نکل بھاگتا تھا۔

ٹرین روہڑی سٹیشن پر آہستہ آہستہ رنگیتی ہوئی جب پلیٹ فام چھوڑنے لگی۔ عظیم کھڑکی میں بیٹھا بڑی اداسی سے فاصلوں کو سمٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک نوجوان اور حسین ترین قد آور لڑکی ایک ہاتھ میں فروٹ کا لفافہ تھا مے آہستہ آہستہ رنگیتی ہوئی ٹرین کی طرف بھاگی۔

ٹرین اب پید پکڑ رہی تھی۔ پہیے تیزی سے کھڑکھٹانے لگے تھے۔ لڑکی جب



ٹرین کے پاس آئی تو گاڑی اس وقت اپنی رفتار کے اثر پذیر عمل میں تھی۔

اتفاق سے وہ لڑکی بھاگتی ٹرین کے اسی ڈبے کو ہاتھ ڈال سکی جس میں عظیم بیٹھا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں فروٹ کالفاؤ ہونے کے باعث وہ اپنا بدن سمیٹ کر اپنے پاؤں فٹ بورڈ پر نہ جما سکی اور اس کے پاؤں پلیٹ فارم کے فرش پر بُری طرح کھٹنے لگے۔ لڑکی نے ایک بھیانک چیخ ماری۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا فروٹ کالفاؤ اس نے پھینک دیا اور دوسرا ہاتھ بھی اس نے گاڑی کے آہنی دستے پر ڈال دیا تھا۔ اب وہ اس حالت میں تھی کہ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ٹرین کو پکڑ رکھا تھا اور اس کے دونوں پاؤں پلیٹ فارم پر بُری طرح کھٹتے جا رہے تھے اور پھر چند ہی گز آگے پلیٹ فارم بھی ختم ہو رہا تھا۔

عظیم بھاگ کر اس کی طرف بڑھا تھا۔ پلیٹ فارم ختم ہو گیا اور عظیم نے آگے بڑھ کر اس کی نعلوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر جب اوپر کھینچا تو لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھ ٹرین کے دستے سے علیحدہ کر لیے۔ وہ بچاری اپنے حواس میں نہ رہی تھی۔ اس کے رد عمل میں عظیم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ لڑکی کے ساتھ لہراتا ہوا ٹرین سے باہر گر گیا۔ دونوں وہاں آکر گرے تھے۔ جہاں مین لائن میں سے کوڑھ جانے والی لائن علیحدہ ہوتی ہے۔ دونوں لوہے کی بیڑی پر گرے تھے۔ عظیم نیچے اور لڑکی اس کے اوپر تھی۔ عظیم کی کمر میں چوٹ آئی تھی تاہم لڑکی بچ گئی تھی۔

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ عظیم اپنی کمر سہلانے لگا تھا اور وہ حسین لڑکی اس کے سامنے کسی سراسیمہ مخلوق کی طرح کھڑی تھی۔ وہ اسے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے

دیکھے جا رہی تھی جیسے کوئی ماورا اور ناویدہ ہستی کہکشاں کے جھروکوں میں بیٹھ کر زمین کی چاہت میں آسمان سے ٹوٹ کر گرنے والے ان شہابِ ثاقب کو دیکھ رہی ہو جو فضا سے بسیط میں روشنی کی ایک لکیر بناتے چلے جاتے ہیں۔ وہ فطرت کا کوئی پرکشش حسین اور معنوم گیت لگ رہی تھی اور استعجاب و استحقاقی انداز میں عظیم کو بس دیکھے جا رہی تھی۔

عظیم کے دوست جمیل نے زنجیر کھینچ کر گاڑی روک دی تھی اور بے شمار مرد عورتیں بھاگتے ہوئے ان کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ لڑکی جو ابھی تک ٹیکٹکی باز عظیم کو دیکھے جا رہی تھی، سنبھلی اپنے آوچے جیسے خوبصورت سُرخ ہونٹوں کو حرکت دی اور پہلی بار عظیم سے مخاطب ہوئی۔

آپ نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں یہ ایک ایسا احسان ہے جس کا شکریہ اور کفارہ ادا نہیں کیا جاسکتا۔ عظیم نے اس کے تمنانے ہوئے سُرخ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں آپ کو گاڑی سے گرتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا تھا۔

بھانت بھانت کے لوگ گاڑی سے اتر کر ان کی احوال پرسی کرنے لگے تھے۔ جمیل بھی بھاگتا ہوا وہاں آیا تھا اور عظیم کو لپٹا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ریلوے کا عملہ بھی موقع پر پہنچ گیا تھا۔ انہوں نے عظیم کو ریلوے ہسپتال روہڑی میں لیجانے کی پیشکش کی پر اس نے کہا میں ٹھیک ہوں اور میرے کوئی چوٹ نہیں آئی۔ گاڑی دوبارہ اپنی منزل کی طرف دوڑ پڑی تھی۔



حیدر آباد ریلوے سٹیشن پر جب گاڑی آکر رُک کی تو عظیم تھوڑی دیر تک کھڑکی سے سر نکال کر پلیٹ فارم کو دیکھتا رہا۔ جیل اس کے قریب بیٹھا سویا ہوا تھا۔ عظیم اُٹھ کر جب ٹرین سے باہر نکلنے لگا تو ایک بیرا کھانے کی ٹرے اُٹھائے وہاں آیا اور ٹرے اور پانی کی بوتل عظیم کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔  
آپ کا کھانا۔

عظیم نے اسے حیرت سے دیکھا۔  
میں نے تو کھانا منگوایا ہی نہیں۔

بیرے نے ٹرین سے باہر پلیٹ فارم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
یہ کھانا آپ کے لیے اس لڑکی نے بھیجا ہے۔

عظیم نے باہر دیکھا۔ پلیٹ فارم کے ستون کے پاس وہی لڑکی کھڑی تھی۔  
جسے عظیم نے بچایا تھا۔

وہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑے عظیم سے کھانا کھالینے کی منت کر رہی تھی اور کسی حسین مو رتی کی طرح کھڑی تھی۔ عظیم اسے اس حالت میں دیکھ کر مسکرا دیا اور کھانا کھانے لگا۔ لڑکی کے چہرے پر طمانیت بکھر گئی تھی اور وہ اس رینڈیر کی طرح تڑا رہتی ہوئی جسے برف زاروں میں کوئی خطرہ نہ ہو اپنے کیا ٹمنٹ کی طرف چلی گئی تھی۔

کراچی ریلوے سٹیشن پر جب گاڑی رُک کی تو عظیم اپنے دوست جیل کے ساتھ اپنا اٹیچی اور بستر اُٹھائے پلیٹ فارم سے باہر آیا وہ دونوں ابھی کسی

ٹیکسی رکشے کا جائزہ لے رہے تھے کہ وہی لڑکی عظیم کے قریب آئی اور اسے مخاطب کیا۔

آپ کہاں جاتیں گے ؟

غیر نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ گلے میں سُرخ رنگ کا چھوٹا سا چمڑے کا خوبصورت بیگ ڈالے مجسمہ حسن بنی کھڑی تھی اور اس کے پیچھے ایک قلمی اس کا سامان اٹھاتے ہوئے تھا۔

عظیم تکدر کے سے عالم میں کھو گیا۔ بدحواسی میں اس نے جمیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مجھے خود علم نہیں کہاں جانا ہے۔ یہ میرا دوست جمیل ہے اس کے یہاں کچھ رشتہ دار ہیں۔ ہمیں ان کے ہاں جانا ہے۔ جمیل بتاؤ ہمیں کہاں جانا ہے۔ جمیل نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس لڑکی طرف بڑھا دیا جس پر ریلوے کالونی کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ لڑکی نے اڈریس پڑھا اور حیرت سے کہا۔

اس پر کوئی مکان یا کوآرڈینٹس نہیں لکھا گیا۔

جمیل نے افسردہ اور مغموم لہجے میں کہا۔

میری بہن! دانشمنوں کے اس شہر میں وہ جھونپڑی ہیں رہتے ہیں اور ہم دونوں کو بھی ان کے ساتھ اس سیلی زمین والی جھونپڑی میں رہنا ہے۔ لڑکی اس ہو گئی۔ عظیم کے اور قریب ہوتے ہوئے اس نے دنگل سے لہجے میں کہا۔

میرا نام کل ہے۔ آپ نے اپنا نام بتایا ہی نہیں ؟

میرا نام عظیم ہے۔



لڑکی نے سرگوشی کی۔ میں کل نو بجے کیماڑی میں اس جگہ آپ کا انتظار کرونگی جہاں سے منوڑہ کو لائیں جاتی ہیں۔

عظیم نے بڑی بے بسی سے کہا۔

میں کراچی پہلی بار آیا ہوں۔ میں نہیں جانتا کیماڑی کیا ہے۔

پھر میں آپ کے ساتھ چلوں گی اور جہاں آپ نے رہنا ہے وہ جگہ دیکھ کر کل میں خود آکر آپ کو لے جاؤنگی۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے۔

تو پھر آئیے میرے ساتھ کل نے اپنا عظیم اور جمیل کا سامان ایک ٹیکسی میں رکھوایا اور انہیں ساتھ لیکر وہ ریلوے کالونی کی طرف روانہ ہو گئی۔ جمیل نے

دور ہی سے اسے وہ جھونپڑی دکھا دی جس میں انہیں جانا تھا اور کل اسی ٹیکسی میں واپس چلی گئی۔ عظیم اور جمیل اپنا سامان اٹھائے اس جھونپڑی کے پاس آئے۔

لیکن وہاں آکر وہ پریشان ہو گئے۔ جھونپڑی کا دروازہ بند تھا اور باہر تالا لگا ہوا تھا۔

دونوں تھوڑی ہی دیر وہاں کھڑے ہونگے کے ساتھ والی جھونپڑی سے ایک

آدمی نکلا اور جمیل بھاگ کر اس سے پٹ گیا۔ وہ اس کا ماموں زاد عارف تھا جمیل

نے پہلے عظیم سے اس کا تعارف کرایا۔ عارف نے اس جھونپڑی کا تالا کھولا اور

دونوں کا سامان اندر لے گیا۔ نرسل کی جھونپڑی میں سامنے والی دیوار کے اندر

لکڑی کا ایک چھوٹا سا دوشن دان تھا کچے فرش کو لپ کر ہوا اور ستر کر دیا گیا

تھا۔ عارف نے جمیل کو مخاطب کر کے کہا۔

یہ جھونپڑی آپ تم دونوں کی ہے۔ میں اور میرا ساتھی جو اس دنت کام پر گیا ہوا ہے۔ ساتھ والی جھونپڑی میں چلے گئے ہیں۔ اس جھونپڑی میں ہمارا ایک مزدور ساتھی رہتا تھا جو کویت چلا گیا ہے۔ اور جاتے ہوئے جھونپڑی ہمیں دے گیا ہے۔ ہم دونوں فرش پر ہی سوتے ہیں اگر تمہیں چارپائی کی ضرورت ہو تو کل لاؤنگا۔ اس کے علاوہ تم دونوں خوش قسمت بھی ہو اس لیے کہ تم دونوں کی سروس کا ایک پٹرول پیپ پر بند و بست بھی ہو چکا ہے۔ اگر کل آرام کرنا چاہو تو کر لو۔ ویسے جب تم دونوں جاؤ، میں تمہیں وہاں لے جا کر تمہاری بات چلی کرواؤنگا۔

عارف نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

ہم کل سنے اپنے کام پر جاتیں گے۔ ہم یہاں آرام کرنے نہیں محنت کرنے آئے ہیں۔ پھر اس نے عظیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میرا ساتھی بی۔ اے ہے کیا اس کے لیے کوئی اچھی سروس نہیں مل سکتی۔ میں تو میٹرک ہوں۔ گاڑیوں میں پٹرول بھرتا رہوں گا۔ پھر اس نے آج تک ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ یہ اپنی امی کا بڑا لاڈلا بیٹا ہے اور چند مجبوریوں کے تحت ایک اچھی نوکری چھوڑ کر یہاں آیا ہے۔

عارف نے اس ہلچے میں کہا۔

اچھی نوکری کے لیے کسی منسٹر کی سفارش چاہیے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اس کیلئے کوئی جزوقتی کام اور تلاش کریں گے۔ اب تم دونوں آرام کرو۔ میں تم دونوں کے کھانے کا بند و بست کرتا ہوں۔ عارف باہر نکل گیا۔ جیل نے جھونپڑی کی صفائی



شروع کر دی۔ غلیم نے بھی اس کے ساتھ کام کرنا چاہا پر جیل نے اسے منع کر دیا اور یوں کراچی شہر میں داخل ہونے والے دو مسافروں نے اپنے بستر مٹی کے فرش پر لگا کر اپنی نئی زندگی کی ابتدا کر دی تھی۔ عارف ان کے لیے کھانا لے آیا اور دونوں نے مل کر کھایا۔

آسمان پر جب رات چھا گئی۔ وہ دونوں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ باہر سمندر کی طرف سے آنے والی سوندھی اور نمکین ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی نرسل کی جھونپڑیوں سے ٹکریں مار رہی تھی۔ غلیم ٹکٹکی باندھے چھت کو دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ شاید ماں بہنوں کی یادوں میں کھو گیا ہو گا یا سانپ کی طرح ڈسنے والے بھائی کا وہ ذہن میں خلجاں پیدا کر گیا تھا۔ اتنے میں جیل نے اسے پکارا۔

غلیم بھائی!

غلیم نے بستر کی چادر سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا — ہوں — سو گئے ہو؟ نہیں۔

پھر کوئی بات کر۔ اپنے پرانے اور اچھے وقتوں کی — غلیم جب خاموش رہا تو جیل پھر لولا — کیا سوچ رہے ہو۔ میں جانتا ہوں تمہیں امی یاد آ رہی ہو گی۔ اس لیے کہ تم کبھی گھر سے نہیں نکلے۔ پر یہاں تو میں ہی تمہارا بھائی ہوں اور ہم دونوں کو مل کر حالات کی سرکش موجوں کے اندر اپنی زندگی کی ناؤ کو کھینا ہے۔ غلیم نے پھر اپنے

آنسو پونچھ لیے اور ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

آب و گل کا یہ جہاں بھی کیا ہے۔ کوئی روتا کوئی ہنستا ہے۔ اپنے تک دھوکہ دے جاتے ہیں کوئی رسم انقطاع نہیں رہی۔ یہاں کوئی باتمی سایوں میں اپنی شام کرتا ہے اور کوئی پہاڑی جھرنوں سے خوش کن گیتوں میں اپنی صبحوں کا استقبال کرتا ہے۔ کوئی بڑی ڈھٹائی کے ساتھ معاندانہ رویے کے ساتھ دوسروں کی ودلیعت اور امانت چھین لیتا ہے اور کوئی چار آنسو بہا کر خاموش ہو رہتا ہے۔ مجھے اس زندگی سے اس جہاں سے نفرت ہوتی جا رہی ہے جس میں نوحاناچی ہے۔ دل شکن بے اعتنائی اور دکھوں کا صعود و نزول ہے۔ — پھر — پھر عظیم غصے میں چلا اٹھا۔ یہاں — یہاں رمیدگی ہے وحشت، جہنم کی کثافت، صدیوں کا بوجھ سمندروں کی کراہ، تولیدگی قنوطیت اور شقاوت ہے۔ میں بھی ان مسافروں سے ایک ہوں جو عوطف و ایال کی تلاش میں لاہور سے کراچی آنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ —

جیل نے دکھ سے کہا۔

خدا تمہاری راہنمائی کریگا۔

عظیم نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

خدا بھی ہم جیسے لوگوں کو ظلمت کے اعماق میں گرتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

وہ بھی ان کی مدد اور راہنمائی کرتا ہے جو پہلے سے خوش اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں۔

ہم جیسوں کو وہ نظر انداز ہی کرتا ہے۔ تم جانو خدا کی طرح اس کی فطرت کے عناصر بھی



اسی جیسے رویے پر عمل کر رہے ہیں۔ کیا تم نے کبھی دیکھا ہے۔ بارش وہیں ہوتی ہے  
 جہاں پہلے سے نمی ہو۔ جلتے، تپتے۔ پھکتے اور پیا سے صحراؤں میں کیوں کالے سیام  
 بادل نہیں برستے۔ ہم جیسے پیا سے اور تشنہ لوگوں کی طرح خدا ان صحراؤں کو بھی نظر انداز  
 کرتا ہے۔ جیسے — جیسے وہ اس کی اپنی تخلیق نہ ہوں۔ اور شیطانی قوتوں نے  
 انہیں وجود بخشا ہو۔ جیل خاموش رہا اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ تھوڑی  
 دیر بعد وہ دونوں گہری نیند سو رہے تھے۔

---



عظیم کی جھونپڑی کے سامنے صبح نو بجے ایک رکشہ رکا اور مکمل اس میں سے باہر نکلی۔ اس نے دیکھا جھونپڑی کے دروازے کو تالا لگا ہوا تھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے اداس ہو گئی وہ مڑ کر رکشے میں بیٹھنا چاہتی تھی کہ ساتھ والی جھونپڑی سے عارف کا ساتھی نکلا اور اس سے قریب آتے ہوئے پوچھ لیا۔

آپ کس سے ملیں گی ؟

مکمل نے مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس جھونپڑی والے کہاں گئے ہیں۔

ہم دونوں نے ان کے لیے زسری کے لیک پٹرول پمپ پر سروس کا انتظام کر

دکھا تھا اور وہ آج ہی اپنے کام پر گئے ہیں کیا آپ ان دونوں میں سے کسی کو جانتی ہیں۔



کمل نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ان میں سے عظیم میرا رشتہ دار ہے وہ جب آتے تو اسے کہتے گا۔ کمل آتی تھی۔ شام کو میں دوبارہ آؤنگی۔ وہ رکشے میں بیٹھی اور چلی گئی۔

شام کو جب وہ دوبارہ آئی تو جھونپڑی کا دروازہ کھلا تھا وہ ہچکچاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ جھونپڑی کے اندر چھوٹے سے صحن میں جمیل تیل کے چولیسے پر ہانڈی پکا رہا تھا اور اس سے قریب ہی عظیم پانی کی بالٹی اپنے پاس رکھے تانبہ چینی کی پلیٹیں دھو رہا تھا۔ شاید وہ بازار سے سارا سامان خرید لاتے تھے اور گھر پر کھانا تیار کرنے کا بندوبست کر لیا تھا۔

کمل کو دیکھتے ہی جمیل کھڑا ہو گیا اور بڑی شفقت سے بولا آدمیری بہن! کمل تیزی سے عظیم کی طرف بڑی اور اس کے پاس بیٹھی ہوئی بولی۔ لائے میں ساری پلیٹیں دھو دیتی ہوں — عظیم نے بڑی انکساری سے جواب دیا میں دھولیتا ہوں۔ آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔ کمل نے زبردستی اس کے سامنے رکھی پلیٹیں اٹھالیں اور دھیمی سی آواز میں کہا میرے ہوتے ہوتے آپ ایسے کام نہیں کر سکتے۔ جمیل بھی ان دونوں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

تم رہنے دو میری بہن! میں خود دھولونگا۔

کمل نے آہستگی سے کہہ دیا — میں دھولیتی ہوں جمیل بھائی! جمیل نے جلدی جلدی ہانڈی اتار کر چولہا بجھایا اور مال لیکر باہر نکلتا ہوا

بولا۔ میں تنور سے روٹی لے آؤں۔ شاید وہ عظیم اور مکمل کو آپس میں بات کرنے کا  
موقع دینا چاہتا تھا۔ جمیل کے باہر نکلتے ہی مکمل نے بڑے پیار سے پوچھا۔  
آپ صبح کہاں چلے گئے تھے۔ میں آئی تھی۔ جھونپڑی کو تالا پڑا تھا۔  
کام پر چلا گیا تھا۔ مجھے سروس مل گئی ہے۔

کہاں؟

ایک پٹرول پمپ پر۔

آپ پڑھے لکھے بھی ہیں نا؟

جی۔ اے ہوں۔

پھر کوئی اچھی سروس کی ہوتی۔ دن پھر پٹرول پمپ پر گاڑیوں میں پٹرول بھرنے  
کی کیا تک ہوتی۔

شکر کر دیہ بھی مل گئی ہے۔ درنہ گھر سے چلتے وقت میں یہ اُمید لیکر گاڑی میں  
بیٹھا تھا کہ کراچی میں مجھے عام مزدوروں کی طرح سینٹ بھری کا کام کرنا پڑے گا۔  
میں چند مجبوریوں کے تحت لاہور سے کراچی آیا ہوں۔  
مکمل نے پیار سے عظیم کی طرف دیکھا۔

کیسی مجبوریاں؟

اداس لہجے میں عظیم نے کہا۔ میں ایک ایسا انسان ہوں جس کا کوئی ماضی اور  
مستقبل نہیں۔ شاید میں اسے یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ میری زندگی میرا ماضی اور موت  
میرا مستقبل ہوتی۔ میں اپنے آپ کو کھوہ چکا ہوں اور اپنی گم گشتہ ذات کو جس کی کوئی



پہچان نہیں ہے اس سیپ کی طرح تلاش کرتا پھر رہا ہوں جسے اپنے کھوتے ہوتے موتی کی تلاش ہو۔ میں روشنی کے گیتوں کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ اگر اپنے مقصد میں کامیاب رہا تو شاید کچھ عرصہ اور زندہ رہ سکوں۔ ورنہ میری روح تکان کے باعث حلول کر جائے گی۔

کمل کے پکے ہوتے انناس جیسے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ میں آپ کی ان باتوں کو سمجھی نہیں۔ کھل کر بتائیں کیا کہنا چاہتے ہیں۔ آپ۔ عظیم نے اپنے اوپر ڈھائے گئے اپنے بھاتی کے ظلم کی داستان کہنا شروع کر دی۔ عظیم اسے اپنی بے بسی کی کہانی سناتا رہا اور کمل اس کے سامنے بیٹھ کر روتی رہی۔ اس کے ہجے میں تندرستی اور بغاوت اتر آتی تھی وہ کسی لپہار سے کی طرح تھکاتھکا لگ رہا تھا اور اس کی زبان بار بار غوطے کھا رہی تھی۔ کمل کی حالت ایسی تھی جیسے تیز طوفانوں میں کسی درخت کی نازک ٹہنی ٹوٹ گئی ہو۔

عظیم جب خاموش ہوا تو کمل نے اس کا ہاتھ اپنے نازک سرخ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

آج سے آپ میرا تن من، جسم و جان اور میری روح و قالب ہیں۔ عظیم نے پرتا شیرنگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کمل! محبت کی رات جیسی اتھاہ تاریکیوں میں کھوہ جانے سے قبل یہ سوچ رکھو کیا آنے والے دنوں میں دو اجنبی مسافروں کی طرح ہماری راہیں الگ تو نہ ہو جائے گی اگر ایسا ہو گیا تو پھر یہ میری زندگی کا آخری حادثہ ہو گا۔

کمل نے پیابہ کی گہری نگاہوں سے عظیم کی طرف دیکھا۔ پھر شاید کوئی فیصلہ کیا اور وہ سختی کے ساتھ اس طرح عظیم سے لپٹ گئی جس طرح بے چین اور طرازدی سمند سے بھٹک رہی ہوتی ہے۔ — میں آپ کو اپنی زندگی کا ساتھی چن چکی ہوں اور پوری زندگی آپ کا ساتھ دوں گی۔ کمل اس سے عظیم کی چھاتی سے لگی یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ تروتازہ پھول جو پوری رات شبنم میں نہاتا رہا ہو۔

عظیم نے لرزاں اور مچھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

کمل! تمہارے دل سے اٹھتی ہوئی محبت کی شعاعیں جنہوں نے تمہارے رخساروں کو تابناک بنا دیا ہے ان کا جواب میں بھی مثبت انداز میں دوں گا۔

جھونپڑی کے دروازے پر کھٹکا ہوا دو دنوں علیحدہ ہو گئے۔ جمیل روٹیاں لیکر لوٹا تھا۔ وہ صحن سے گزر کر سیدھا اندر چلا گیا۔ جھونپڑی کے فرش پر ایک بہت بڑی چٹائی بچھائی گئی تھی جس پر ذرا فاصلہ رکھ کر دو بستر لگے تھے اور درمیان میں کچھ جگہ خالی تھی۔ جمیل نے اس درمیانی جگہ میں کھانے کے برتن لگائے پھر دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی۔ — آؤ کھانا کھاؤ! عظیم نے کمل سے کہا۔

چلو کھانا کھائیں — کمل نے مسکرا کر کہا۔ مجھے بھوک نہیں کھالیں جا کر مجھے اجازت دیں۔ میں اب جاتی ہوں۔ التوا کو صبح ہی صبح آؤنگی اور آپ کو شہر میں گھاؤنگی کمل جھونپڑی سے باہر نکل گئی اور عظیم اندر جا کر کھانا کھانے لگا۔ ایک روز عظیم پوگر اوڈنڈ کے پاس سے گزرتا ہوا ریلوے کا بونی کی طرف جا رہا



تھا کہ اس نے دیکھا ٹرک کنارے ایک موٹر سائیکل گرا پڑا تھا اور بوڑھا سا ایک آدمی جو لباس اور وضع قطع سے کوئی باحیثیت انسان لگتا تھا پولو گراؤنڈ کے اندر زمین پر بے سدھ سا پڑا تھا۔ عظیم نے اس کے بوٹ جرابیں اتاریں اور کچھ دیر تک وہ اس کے پاؤں گرٹا رہا پر وہ بوڑھا آدمی ہوش میں نہ آیا۔ عظیم نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ سردی کے باوجود اس کا چہرہ تپ رہا تھا اور پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ بوڑھے کے دونوں ہاتھ بڑے کرب کے انداز میں دل پر اس طرح رکھے تھے جیسے اس نے اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو تھام رکھا ہو۔

عظیم نے اس کے دونوں ہاتھ ہٹاتے اور اس کے دل کی جگہ کو آہستہ آہستہ رگڑنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس بوڑھے نے آنکھیں کھولیں۔ پریشانی کے عالم میں پہلے اپنے چاروں طرف اس نے نگاہ دوڑائی۔ پھر اس کی نگاہیں عظیم پر مرکوز ہو گئیں اور بڑی شفقت سے دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

تم کون ہو بیٹے!

عظیم نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا — میں ایک ایسا انسان ہوں جو دوسرے انسان کو تکلیف اور دکھ میں دیکھ کر رک گیا ہے۔ میرا نام عظیم ہے۔

بوڑھے نے مردہ سی آواز میں کہا۔ شاید تم اس بیسیویں صدی کے بہترین ہوتوں میں سے ہو۔ میری گاڑی بھی شاید تمہیں نے اٹھائی ہے۔

جی ہاں۔ پر آپ کو ہوا کیا۔

بوڑھے نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میرا نام فرانسس ہے۔ دل کا مریض ہوں بیٹے۔ آفس سے لوٹ رہا تھا کہ اچانک  
دل کا ایک ہو گیا۔ گاڑی سے گر پڑا اور یہ حالت ہو گئی۔  
آپ کس آفس میں کام کرتے ہیں۔

بی۔ آئی۔ ڈی۔ سی بلڈنگ میں بنک آف ہندو پوکے ہیڈ آفس میں اکاؤنٹنٹ ہوں۔  
عظیم نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ اسے موٹر سائیکل کے پاس لاکر پھلی سیٹ  
پر بٹھایا اور خود وہ موٹر سائیکل وہاں سے نکال کر میکوڈ روڈ پر لایا۔ ایک کیفے کے  
سامنے وہ رکا۔ فرانسس کو سہارا دے کر وہ اندر لے گیا۔ پہلے ٹائٹل میں اس کا منہ  
ہاتھ دھلایا۔ اور پانی کا ایک ٹھنڈا گلاس اسے پلانے کے بعد عظیم نے چاستے  
منگوائی اور دونوں بیٹھ کر پینے لگے۔

فرانسس نے عظیم کے سر پا کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا — تم کہاں کام کرتے  
ہو بیٹے!

میں اس شہر میں اجنبی ہوں چند روز ہی ہوتے لاہور سے وارد ہوا ہوں۔ سروس  
کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور فی الحال ایک پٹرول پمپ پر سروس مل گئی ہے۔  
فرانسس نے قد سے چونکتے ہوئے پوچھا۔

تمہاری تعلیم کیا ہے ؟  
بی۔ اے فسط کلاس ہوں۔

فرانسس نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر عظیم کو تھماتے ہوئے کہا۔ کل میرے  
آفس آؤ میں تمہیں کلرک کی جاب دلا دوں گا۔ آجکل کچھ دکنیاں بھی ہیں۔ ضرور آنا۔ تمہارا



کام کرتے مجھے اطمینان و سکون قلب ہوگا۔

عظیم کھڑا ہو گیا۔ آپ اب چلے جائیں گے۔ یا میں چھوڑ آؤں۔ تمہارا شکر یہ بیٹے۔  
میں اب ٹھیک ہوں۔ دونوں کیفے سے نکل کر اپنی اپنی سمت چلے گئے۔

دوسرے روز پٹرول پمپ جانے کے بجائے عظیم فرانسس کے پاس اس کے  
آفس چلا گیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا اور استقراری آفیسر سے مل کر اس نے عظیم کو تقرری  
کالیٹر اشو کر دیا۔ اگلے روز سے عظیم فرانسس کے ساتھ بنک میں بحیثیت کلرک کام  
کرنے لگا تھا۔

---



اتوار نو بجے کے قریب کل طوفان کی طرح جھونپڑی میں داخل ہوتی جلدی جلدی  
 غظیم کی تیاری کرائی اور اسے ساتھ لیکر باہر نکل گئی۔ میکلڈوڈوڈو آکر انہوں نے رکشہ لیا اور  
 دونوں یزید ٹاڈ اور ادریکھاڑی سے ہوتے ہوئے بندرگاہ میں اس جگہ آئے جہاں سے  
 منوڑہ کو لاسنچیں جاتی ہیں۔ راستے میں کل اسے سڑکوں اور معروف جگہوں کے نام  
 بتاتی رہی تھی۔

کل جب لاسنچ میں بیٹھنے لگی تو غظیم نے پریشانی میں پوچھا کہاں جا رہی ہو؟  
 کل نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ بس آپ خاموشی سے میرے  
 ساتھ چلے آئیے۔

لاسنچ سے دونوں منوڑہ آئے۔ اتوار ہونے کے باعث جزیرے میں تفریح کیلئے  
 آنے والے لوگوں کا خوب رش تھا۔ کچھ دیر تک دونوں پاؤں سے جوتے اتار کر ساحل کی



گیلی ریت پر چلتے رہے۔ پھر دونوں نے ایک ساتھ اونٹ کی سواری کی۔ دوپہر تک وہ ساحل پر گھومتے رہے پھر ایک کینے سے کھانا کھا کر وہ ساحل سمندر کی کالی سیام اور سنگلاخ پٹانوں کے اوپر جا کر بیٹھ گئے۔

عظیم کچھ دیر تک اپنے سامنے بیٹھی ہوتی مکمل کو دیکھتا رہا۔ گوری چٹی قد آور تیکھے نقوش اور گداز جسم والی وہ لڑکی اس سے اسے یوں دکھائی دی تھی جیسے حسن اور شباب کی امنگوں کا کوئی سرمدی وجود رکھنے والا ابلتا ہوا چشمہ ہو۔ اس کے جسم سے ہلکی ہلکی سونفلی مہک اُٹھ رہی تھی وہ دتنا گرمی کے اس پھول کی طرح تھی جو پوری طرح کھل کر ہواؤں میں اپنی خوشبو بکھیر کر اپنے اصل کا انتظار کر رہا ہو۔

عظیم نے اسے مخاطب کیا۔ مکمل اتم نے اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا کہاں رہتی ہو کیا کرتی ہو اور ٹرین میں حادثے کے روز تم کہاں سے آ رہی تھی۔

مکمل نے صحراؤں اور بیانون میں آزادی اور بے فکری کے قہقہے لگانے والی چاندنی کی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم لوگ کیمادی میں رہتے ہیں۔ حادثے والے روز میں لاہور میں ہونے والی ایک اسکاؤٹ ریلی میں حصہ لیکر لوٹ رہی تھی۔ میں ایک مقامی کالج میں بی۔ اے کے آخری سال کی طالبہ ہوں۔ ہم لوگ کمپین ہیں اور گھر کے تین افراد ہیں۔ میرے ابو ہیں اور میری چھوٹی بہن جس کا نام سیل ہے۔ میری ماں سری لنکا کی رہنے والی ایک بدھسٹ تھی۔ چند برس قبل اس کی ملاقات ایک مقامی مسلمان سے ہوئی۔

دونوں کے تعلقات بڑھے اور پھر وہ پلید انسان ایک روز میری می کو بہلا پھسلا

کراخوا کر کے لے گیا۔ اس طرح ہم دونوں ہمیں اپنے باپ کے پاس تنہا رہ گئیں۔ میرے  
 ابو قیام پاکستان کے وقت ضلع ہوشیار پور کی تحصیل گردہ شکر سے ہجرت کر کے آئے تھے۔  
 یہاں آکر وہ اپنے نام کوئی مکان الاٹ کرانے میں کامیاب نہ ہو سکے اور آج تک ہم کرائے  
 کے مکانات میں گزار بسر کرتے آرہے ہیں۔ بس یہ ہے۔ میری داستان۔ کل خاموش ہو گئی۔  
 غلیم ویران و ملول بھری نظروں سے کل کی طرف دیکھنے لگا۔ کل نے گھبرا کر اس کا بازو  
 پکڑ کر جھنجھوڑا۔ آپ کہاں کھو گئے ہیں۔  
 غلیم نے غوطے کھاتی آواز میں کہا۔

کل!

ہوں!

تمہاری ماں کو وہ غلانے والا غیر کر سچین تھانا!

ماں!

تمہارے ابو کو ایسے لوگوں سے نفرت نہ ہو گئی ہوگی۔ جیکہ میں بھی غیر کر سچین ہوں۔  
 کیا وہ پسند کریں گے کہ ان کی بیٹی کسی غیر کر سچین سے محبت کر کے اسے اپنی زندگی اور  
 جیون کا ساتھی چن لے۔

کل نے اداس اور مغموم لہجے میں کہا۔

میرے ابو مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں میں انہیں اس پر آمادہ کر لوں گی کہ  
 وہ آپ کو میرا ہمسفر مان لیں۔  
 اگر وہ رضا مند نہ ہوتے تب؟



آپ اتنے فاصلوں اور بعد کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ عظیم چند لمحوں تک پرسکوت رہنے کے بعد ملول لہجے میں بولا۔

آج کے بعد مجھ سے نہ ملا کرنا کمل !

کمل کا جسم کپکپا گیا اور چونکتے ہوئے اس نے کہا۔

کیوں؟ — میں آپ کی پوجا کرتی ہوں۔ کیا آپ کو مجھ سے پریم نہیں آپ سے مل کر مجھے شانتی اور میری روح کو چین و سکون ملتا ہے۔

پرتم سے ملتے ہوئے اب میری روح کی شانتی جاتی رہے گی۔ کیونکہ میرے دل میں اب یہ بات پیوست اور استوار ہو جاتے گی کہ ہم دونوں ایک ہو کر شادی نہیں کر سکتے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ تمہارے ابو تمہاری بات مان جائیں۔ اور قبل اس کے ہم محبت میں اس قدر دور نکل جائیں کہ حالات کی مخالفت کے باعث وقت کی دھول اور فاصلوں کی زنجیروں میں اُلجھ جائیں۔ ہمیں ابھی سے۔ علیحدہ ہو جانا چاہیے کہ ابھی تک ہم ابتدائی مراحل میں ہیں۔

کمل پر عجیب و غریب کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ اس کی حالت اس اندھی شمع جیسی تھی جو ہوا کے تیز جھکڑوں میں جل بجھی ہو۔ اور وہ بڑی حسرت سے عظیم کو دیکھے جا رہی تھی۔

دونوں ایک دوسرے کے سامنے چپ اور اداس بیٹھے تھے۔ ان کے قریب نیلا سمندر سرگوشیاں کرتا ہوا اکراہ رہا تھا۔ سمندری لہریں چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ان جانے دلیوں سے آتی ہوئی سمندری ہوا میں کچے ناریل کی سی خوشبو

رچی بسی تھی۔ دونوں خاموش تھے۔ جسے وہ کوئی ناطق وجود نہ رکھتے ہوں بلکہ وہ مجھے ہوں جو جزیرہ کی ان چٹانوں پر ایستادہ کر دیئے گئے ہوں۔ جزیرے کے لمبے لمبے ناریل کے درختوں سے نمکین بحری ہوائیں ٹکرا کر جنگلی گیتوں کی صدا تیں پیدا کر رہی تھیں۔

کمل بنجر زمین کی طرح ویران اور سردیوں کے تنہا پہاڑی پھول کی طرح اداس ہو گئی تھی۔ اُس کی حالت ان لہروں جیسی ہو گئی تھی جو سمندر سے بچھڑ کر ساحل کی ریت میں جذب ہو رہی ہوں۔ دردِ محبت کرنے والے وصال اور جدائی کے سنگم پر کھڑے تھے۔ اپنے دل میں کچھ غیر متشکل جذبے لیے وہ قریب و بعید کا امتیاز بھول کر کسچ پنہاں راز کی ابدیت میں کھوہ گئے تھے اور ان کے قریب بے رحم اور سویا ہوا سمندر اپنی بھیانک آوازوں میں اُونگھ رہا تھا اور شیطان کی طرح سیاہ چٹانیں لہروں سے گلے مل کر قہقہے لگا رہی تھیں۔ وحشی اور ہیتناک قہقہے۔

کمل کی آواز یوں بلند ہوتی۔ جیسے کسی زخمی کی کراہ یا مرنے والے کی درد اور کرب میں ڈوبی ہوئی کوئی صدا ہو۔ اس نے غلیم سے پوچھا۔

کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے۔

غلیم کی لرزتی آواز سنائی ہے۔

کمل! میرے دل میں تمہارے لیے ایک جذبہ ضرور ہے جسے تم ہمدردی،

انس اور محبت یا ایسے ہی کسی اور لفظ کا نام دے سکتی ہو۔

کیا محبت جو روح کی گہرائیوں کے ایک لطیف جذبے کا نام ہے اسے زمانے



کے مادی ترانوں سے ناپا جاسکتا ہے۔

نہیں۔

پھر آپ یوں بے رحمی کے ساتھ مجھ سے کیوں روکشی کر رہے ہیں۔ مکمل کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کر اس کے سُرخ چکنے رخساروں پر بہہ نکلے تھے۔

عظیم کی روتی ہوئی سی آواز ابھری۔ مکمل تمہیں میرے حالات کا علم ہے میں ایسا برگشتہ محبت، پریشان و محبوب انسان ہو جسے اس کے بھاتی نے ذہریلے سانپ کی طرح ڈس لیا ہے۔ میں ایک ایسا مسافر ہوں جس کے پاس تنکا تک نہیں رہ گیا۔ میں تمہاری محبت میں ابھی زیادہ دُور نہیں جانا چاہتا۔ کل کو اگر تمہیں بھی مجھ سے چھین لیا گیا تو میری روح کو میرے جسم سے نفرت ہو جائے گی اور میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ مکمل! میں اپنے آپ کو بار بار دھوکہ نہیں دے سکتا۔ مجھ میں اب کاغذی محل اور ریت کے گھر وندے تعمیر کرنے کی سکت نہیں رہی۔ اپنی زندگی کی کتاب میں کوئی حسین اور دلکش نقش بنانے سے قبل مجھے یہ سوچنا ہو گا کہ میری زیست کی ٹہنی پر کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ اور کیا ان سے اُلجھ کر میرا دامن پھرتا تا رہتا ہو جائیگا۔

مکمل سنبھلی اور پرتاثر نگاہوں سے عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنے تمام روحانی عناصر کو مجتمع کرتے ہوئے آتشیں لہجے اور انسانیت کے پورے وقار کیساتھ کہا: آپ میرے ساتھ پھر ایک وعدہ کیجئے۔

کیسا وعدہ؟

جب تک میں اپنے ابو کو اپنی محبت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کر لیتی آپ مجھے مجبور



تو نہ جاتیں گے۔ غلیم نے مروہ سی آواز میں کہا۔

اگر تم مجھے نہ بھی مل سکی تو بھی میں تمہارے سلوک، تمہارے رویے اور خلوص کو بھول نہ سکونگا۔ میرے ذہن میں ہمیشہ تم خوشبو بن کر رہتی رہو گی۔

کل بیکہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ میں بھی آپ سے ایک وعدہ کرتی ہوں۔ میں اب آپ سے اس وقت ملونگی۔ جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہوں گی۔ میں آپ کے لیے اپنے اہو کی بوندیں تو فراہم کر سکتی ہوں۔ آپ کو دھوکہ نہیں دے سکتی۔ میں با عصمت کھڑکی ہوں اور آپ کے تقدس کے ساتھ مل کر میں ایک نئی زندگی کو ابتدا کرونگی۔

اگر تم ایسا کر سکی تو میں سمجھونگا۔ میری روح کو میرے جسم سے محبت ہو گئی ہے۔ غلیم کھڑا ہو گیا۔ اٹھوا ب چلیں۔

پکمل بھی کھڑی ہوتی ہوتی بولی۔ شام کا کھانا یہیں کھا کر علیحدہ ہوں گے۔ دو محبت کرنے والوں کی طرح نہ ہی۔ دو دوستوں اور دو اجنبیوں کی طرح ہی ہی۔

شام کا کھانا انہوں نے وہیں اکٹھے بیٹھ کر کھا۔ بوجھل دلوں کے ساتھ وہ کیمناڑی آئے اور جب سورج اپنے غروب ہونے والے مناظر کے ساتھ فضاؤں میں شفقی رنگ بکھیر رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔





وقت کا اندھا مسافر اپنی جانی پہچانی منزلوں کی طرف بھاگتا رہا۔ سورج چنار کے بوڑھے درختوں کو چومتا ہوا غروب ہوتا رہا۔ سائے پھیلنے اور سمٹتے رہے اور زندگی کہیں الجھتی اور کہیں سلجھتی رہی۔ عظیم بڑی محنت اور تندرہی سے بینک میں کام کر رہا تھا۔ وہ بڑی باقاعدگی سے ہر ماہ امی کو اپنی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ بھجوا دیا تھا۔ کئی ماہ گزر چکے تھے۔ اس کی ملاقات کمل سے نہ ہوتی تھی۔ شاید وہ اسے بھول چکی تھی۔ یا ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتی تھی۔

آج بھی جب وہ اپنے آفس کے کام میں بڑی طرح مصروف تھا۔ اس کے پہلو میں اپنی میز پر کام کرتے بوڑھے فرانسس نے اسے پکارا۔  
 عظیم! — وہ چونکا اور فرانسس کی طرف دیکھنے لگا۔  
 لیجئے نا تم ہو گیا ہے۔ چھوڑو اب کام کو۔

عظیم اٹھ کر جب باہر جانے لگا تو فرانسس نے پھر اسے پکارا۔ فوراً ادھر آنا عظیم  
— وہ اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔  
کیسے۔

بیٹھو!

وہ بیٹھ گیا۔ فرانسس نے فائلوں کے ریک سے ٹفن کیریز نکالا اور اپنے  
سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا — باہر کہاں جاؤ گے۔ کھانا کافی ہے۔ دونوں مل کر  
کھا لیتے ہیں۔ فرانسس نے بڑے شفقانہ انداز میں کہا تھا۔  
عظیم نے بڑی انکساری سے کہا۔

آپ روز ہی مجھے کھانا کھلا دیتے ہیں۔ آپ کا کھانا کافی لذیذ ہے۔ اگر مجھے ایسا  
کھانا کھانے کی عادت ہو گئی تو میری ایک اور عادت خراب ہو جائے گی۔  
فرانسس نہیں دیا۔

کھاؤ کھاؤ۔ عادی ہو جاؤ گے تو کیا ہوا۔ میرا کھانا ویسے بھی ضرورت سے زیادہ  
ہوتا ہے۔۔۔ عظیم نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

ضرورت سے زیادہ نہیں ہوتا۔ لایا جاتا ہے۔

فرانسس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھانے کی طرف کھینچا۔

چلو یوں ہی رہی۔ اب شروع تو کر دنا — دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ اس کے

بعد چائے پینے وہ آفس سے نکل کر ہوٹل چلے گئے۔

جب وہ واپس آئے تو چپڑاسی نے عظیم کو سفید رنگ کا ایک لفافہ تھمتے ہوئے



کہا۔ آپ کی تار ہے عظیم بالو!

عظیم متفکر سا ہو گیا اور جلدی جلدی لفافہ کھول کر پڑھنے لگا۔ فرانس نے تجسس نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

خیریت ہے نابیٹے!

عظیم نے کاغذ تہ کر کے جیب میں ڈال لیا۔ خیریت ہی ہے۔ میری امی اور چھوٹی بہن مجھے ملنے کل کراچی آرہی ہیں۔ فرانس جو عظیم کے پورے حالات سے واقف تھے اسے کریدتے ہوئے بولے۔

کیوں آرہی ہیں تمہاری امی! اور وہ بھی اس قدر عجلت میں۔

عظیم نے بے پروائی سے کہا۔ ملنے آرہی ہیں۔ دوبارہ وہ اپنے روزمرہ کے کام میں لگ گیا۔

اس روز آفس سے نکل کر عظیم نے ایک نئی چارپائی خرید لی اور جمونپٹری میں لگا دی۔ ماں جو آرہی تھی۔ عارف دوسرے دوستوں کی جمونپٹری میں منتقل ہو گیا تھا۔ دوسرے روز عظیم نے آفس سے چھٹی کر لی۔ اور ماں کو لینے ریلوے سٹیشن چلا گیا۔ کافی دیر تک وہ پلیٹ فارم پر ٹہلتا رہا۔ آخر پانچ بجے کے قریب گاڑی آئی اور وہ زمانہ ڈبے بڑی تیزی سے دیکھنے لگا۔

ریمانہ ایک ڈبے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ صائمہ بھی اس کے ساتھ تھی۔

عظیم ان دونوں کو دیکھ چکا تھا۔ لہذا تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔ ریمانہ نے جونہی عظیم کو دیکھا۔ نیچے اتری اور عظیم کو لپٹا کر بڑی طرح پیار کرنے لگی۔ عظیم نے آگے بڑھ کر

صائمہ کو اٹھالیا اور اسے پیار کرنے لگا۔

ماں اور بہن کو لیکر وہ جھونپڑی میں آیا۔ ریحانہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے بڑی حیرت اور پریشانی میں پوچھا۔  
یہاں رہتے ہو بیٹا! ؟

عظیم ٹال گیا۔ امی! یہاں رہائش کا بڑا مسئلہ ہے اس لیے مجبوراً اس جھونپڑی میں رہنا پڑا ہے۔ ریحانہ سمجھ سی گئی۔ تاہم وہ خاموش رہی۔ اس کے چہرے کی کیفیت اور تاثرات بتا رہے تھے کہ عظیم کی حالت دیکھ کر اسے دکھ اور صدمہ ہوا ہے۔ شام ہو رہی تھی عظیم نے ہوٹل سے کھانے کا بندوبست کیا اور تینوں نے مل کر کھالیا۔

عظیم نے امی اور بہن کے لیے اپنا بستر چارپائی پر لگا دیا تھا اور دوسرا بستر جو عارف کا تھا وہ اس نے اپنے لیے زمین پر لگا دیا تھا۔ صائمہ کھانا کھانے کے بعد جلدی سو گئی تھی۔ ریحانہ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد جب چارپائی کی طرف آئی تو عظیم زمین پر بستر لگاتے اس پر بیٹھا تھا۔ ریحانہ نے خفگی اور تکلیف دہ احساس کے ساتھ کہا۔

یہاں کیوں بیٹھے ہو بیٹے ؟

عظیم کی گردن ذرا سی جھک گئی۔ یہ چارپائی تو میں آپ کے لیے لایا ہوں امی! میں نیچے ہی سوتا ہوں۔ یہاں چارپائیوں میں کھٹمل بہت ہو جاتے ہیں اور ان پر سویا نہیں جاتا۔ ریحانہ سوچوں میں کھوہ گئی اور کپکپاتی آواز میں کہا۔

جب تک میں یہاں ہوں تم نیچے نہیں سوؤ گے بیٹے! میں نے پہلے ہی تمہارے بہت غم اور دکھ برداشت کیے ہیں۔ اب مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی کہ تمہیں اس حالت



میں دیکھ سکوں۔ عظیم کھڑا ہو گیا۔ ریحانہ کا ہاتھ پکڑ کر اس نے بستر پر بٹھایا اور دوبارہ اس کے پاؤں کے پاس اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔  
 مجھے اگر آپ جیسی ماں کے قدموں میں ہی جگہ مل جاتے۔ تو میں جان لوں گا میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں۔ آپ نے اولاد کی بہت خدمت کی ہے امی۔ آپ ہمارا فرض ہے۔ آپ کی خدمت کریں۔ ریحانہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور وہ چپ ہو گئی تھی۔ عظیم کی گردن بھی جھک گئی تھی۔ پر یہ سکوت جلد ہی ٹوٹ گیا۔ ریحانہ بولی تھی۔

ادھر میرے پاس آکر بیٹھو بیٹیا! میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔  
 عظیم جان گیا تھا کہ ماں کیا کہنے والی ہے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کوئی بہت بڑا اور بے رحم طوفان اٹھنے والا ہے۔ ریحانہ کے پاؤں پکڑتے ہوئے اس نے کہا میں یہیں آپ کے قدموں میں ہی اچھا لگتا ہوں۔ آپ کہیے کیا کہنا چاہتی ہیں امی!  
 ریحانہ اندر ہی اندر رو رہی تھی اور بڑی مشکل سے اس نے اپنی آنکھوں کے اندر اپنے آنسوؤں کو روک رکھا تھا۔ وہ کہنے کی ابتدا کرنا چاہ رہی تھی۔ پر کامیاب نہ ہو رہی تھی۔ آخر ضبط کرتے ہوئے وہ بول ہی پڑی۔

تمہاری خالہ عطیہ کی شادی کر دینے پر زور دے رہی ہے اور ساتھ ہی وہ عامر کی شادی بھی کر دینا چاہتی ہے۔ میں اسے معقول جواب نہیں دے سکی۔ میں ایک عجیب الجھن میں پڑ گئی ہوں بیٹے۔ جسے میں تمہاری مدد کے بغیر حل نہیں کر سکتی۔  
 عظیم نے گہری آواز میں پوچھا۔

کیا آپ نے اسی خاطر یہاں آنے کی زحمت کی ہے؟  
ہاں بیٹے!

عظیم کا سر پھر جھک گیا۔

کیا میں نے آج تک آپ کے کسی فیصلے کے خلاف سر اٹھایا ہے۔

رہی جانہ روپڑی۔ نہیں میرے بیٹے!

پھر آپ مجھ پر اعتماد رکھ کر جو بھی فیصلہ کر دیتیں۔ میں کبھی اس سے روگردانی نہ کرتا۔ آپ کی بات رکھنے کی خاطر اگر مجھے اپنی ذات کو بھی کھونا پڑے تو کبھی افسوس نہ کروں گا۔

رہی جانہ کے گرم گرم آنسو عظیم کے ہاتھوں پر گر پڑے اور لرزتی آواز میں وہ بولی مجھے خبر تھی بیٹا! مگر اس میں تمہارے مستقبل کا بھی سوال تھا اور دو بھائیوں کے درمیان کشیدگی، رنجش اور تعلقات منقطع ہونے کا بھی اندیشہ تھا۔

کانپتی اور روتی آواز میں عظیم نے جواب دیا۔

جب تک میری ماں مجھ سے خوش ہے۔ مجھے اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فکر نہیں۔

رہی جانہ اپنی پوری قوت مجتمع کر کے پوچھا۔

اگر عاصفہ کی شادی کسی اور سے ہو جائے تو تمہارا رد عمل کیا ہوگا۔

عظیم کچھ دیر خاموش رہا۔ یوں لگتا تھا وہ کہیں ڈوب گیا ہو پھر اس کی آنسوؤں میں بھینگی ہوتی سی سنجھت آواز ابھری۔



میرا رد عمل کیا ہونا ہے امی! حالات اگر میرے خلاف ہی فیصلہ دے چکے ہیں۔  
تو آپ دیکھیں گی میں ثابت قدم رہوں گا اور کبھی شکایت میں ہونٹ نہ کھونٹوں گا۔  
وہی عظیم ہوں امی! آپ مجھ پر اعتماد رکھیں۔ حالات جس طرح آپ کو مجبور کرتے ہیں آپ  
ویسے ہی کر گزریں۔ عظیم اپنی ماں کے فیصلے کو ٹالنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔  
ریحانہ کھل کر ہچکیوں میں رو پڑی۔

میں تو ایسا نہ دیکھ سکتی تھی بیٹا! پر عاصفہ نے خود ہی اپنی ماں سے کہہ دیا ہے کہ  
وہ عظیم کے بجائے قیصر سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اب تم ہی فیصلہ دو۔ میں کیا کروں؟  
فیصلہ کن انداز میں عظیم بولا۔ بس آپ ان دونوں کی شادی کر دیں۔  
ریحانہ اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

اب میں سمجھی ہوں کہ تم گھر سے بھاگ کر یہاں کوئی آتے ہو۔ اور تم نے ریلوے  
ٹیشن پر مجھے منگنی کی انگوٹھی کیوں اتار دی تھی۔ کاش تم نے مجھے اس وقت بتا دیا  
ہوتا تو میں حالات کو سنبھال لیتی۔ لیکن اب بات بہت دیر نکل چکی ہے۔ اور میں  
اب کچھ نہیں کر سکتی۔

عظیم نے حلق میں ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔  
خالی کب تک شادی کرنا چاہتی ہے؟  
وہ تو اگلے ہفتے ہی تیار ہے۔

تو کر دیں آپ۔

تمہارا عندیہ لینا بھی تو ضروری تھا بیٹے!

میری طرف سے اجازت ہے امی! خوشی سے کہہ رہے ہو، ریحانہ کے آنسو پھر چھپک پڑے۔  
 قیصر میرا چھوٹا بھائی ہے امی! اس کی خوشی میری خوشی ہے اور پھر جب عاصف  
 نے خود ہی اس سے شادی کرنے کو کہہ دیا ہے تو میں کون ہوتا ہوں ناراض ہونا والا۔  
 ریحانہ پھر بولی۔ ان دونوں کو سروس بھی مل گئی ہے۔ قیصر ایک پرائیویٹ فرم  
 میں سیل آفیسر ہو گیا ہے اور عاصف ایم۔ ایس سی کے بعد لیکچرار ہو گئی ہے۔  
 عظیم خاموش رہا اور کوئی جواب نہ دیا۔ ریحانہ بھی چند لمحوں تک کچھ سوچتی رہی  
 پھر بولی۔

تو پھر تم کل میرے ساتھ چلو میں تمہیں لینے آتی ہوں۔  
 عظیم کا سراسی طرح جھکا رہا۔ میں ضرور چلوں گا امی! میں اتنا بزدل نہیں کہ  
 اپنی آنکھوں سے اپنی شکست کا منظر نہ دیکھ سکوں۔  
 میری ایک شرط بھی ہے بیٹے!

کہتے۔

قیصر اور عظیم کے ساتھ تمہاری شادی بھی ہو جائے۔ میں سعادت بھائی سے  
 بات کی تھی۔ انہوں نے آسہ سے تمہارا رشتہ قبول کر لیا ہے۔ میں نے ایک ماں کی  
 حیثیت میں خود آسہ سے بھی پوچھا تھا وہ تم سے شادی پر خوش ہے۔  
 عظیم کی آنکھوں سے لگاتار آنسوؤں کے کئی قطرے ٹوٹی ہوئی سمرن کے موتیوں  
 کی طرح گرے اور اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ریحانہ بچاوری بیتاب ہو کر



رہ گئی۔ ماں جو تھی عظیم اس کے سامنے بیٹھا رو رہا تھا۔ عظیم بہ جو اس کی جان اور روح تھا۔ بھلا وہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ قبل اس کے وہ کچھ کہتی۔ عظیم ناتواں اور مدہم آواز میں کہتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

میں ابھی شادی نہ کرونگا می! یہ معاملہ جہاں تک بڑا ہے وہیں روک دیں۔ پھر وہ زمین پر نہ بچھے ہوئے بستر پر لیٹ گیا اور چادر اوپر کھینچ لی۔ ریحانہ کو اتنی ہمت نہ ہوتی۔ وہ اس سے کوئی اور بات کرے وہ اس طرح حسرت سے دیکھنے لگی جیسے اس کا عزیز بیٹا اس سے کوئی چھین لے جا رہا ہو۔

---



تقدیر ایک بار پھر خوفناک روپ میں اس کے سامنے آکھڑی ہوتی تھی گھر کے  
جس گھٹے گٹے ماحول سے وہ بھاگتا تھا اور جہاں سے اسے روحانی کرب اور جذباتی  
ایسجان ملا تھا وہ پھر وہاں آگیا تھا۔ ریحانہ اسے اپنے ساتھ گھر جو واپس لے آتی تھی۔  
قیصر کی عاصفہ اور عطیہ کی عاصفہ کے بھائی سے شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔  
ریحانہ اور سعادت کی خواہش تھی کہ عظیم کی شادی ساتھ ہی ساتھ آسیہ سے ہو  
جائے۔ پر عظیم نے شادی کرنے سے قطعی اور زوردار انکار کر دیا تھا۔ سعادت نے  
لاکھ سمجھایا۔ ریحانہ نے اونچ نیچ سے آگاہ کیا لیکن وہ نہ مانا۔ اس لیے قیصر اور عطیہ کی  
شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ عاصفہ اپنے گھر جا چکی تھی۔

عظیم اپنے بھائی بہن کی شادی کی تیاریوں میں بُری طرح مصروف ہو گیا۔ دن  
رات بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ ظاہراً وہ مطمئن اور بشاش تھا۔ لیکن اس کے دل میں جو





لا وہ اُبل رہا تھا۔ ریحانہ اس سے پوری طرح باخبر تھی۔ وہ جب بھی عظیم کو یوں لگن سے کام کرتے دیکھتی اکثر چھپ چھپ کر رو دیتی تھی۔

بہر حال عظیم نے اپنے آپ کو بدل لیا تھا۔ خاموش خاموش اور سنجیدہ عظیم پھر کہیں کھوہ گیا تھا۔ اور اس کی جگہ اب پرانا عظیم تھا۔ جو بات بات پر اپنی امی اور بہن بھائیوں کے ساتھ قہقہے لگانے لگا تھا۔ وہ سب کچھ مصنوعی ہی ہے پھر بھی اس نے اپنے آپ کو بدل تو لیا تھا نا۔ ریحانہ اور عطیہ اکثر عظیم کی اس حالت پر خوفزدہ ہو جاتی تھیں۔ جس روز قیصر کی بات جانا تھی۔ عظیم بے حد خوش تھا۔ ریحانہ اور عطیہ بھی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ پر ویسے نہیں جس طرح ہونا چاہیے تھا۔ وہ دونوں ماں بیٹی محسوس کرتی تھیں جیسے اس گھر کی کوئی قیمتی چیز کھوہ گئی ہے۔ وہ جب عظیم کے باطن میں جھانکتی تھیں تو انہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ وہ عظیم نہیں جو ان کا تھا یہ کوئی مصنوعی اور مشینی عظیم تھا جیسے شادی کی تقریب میں حصہ لینے کے لئے مشینی انداز میں چابی دیکر وہاں بھیج دیا گیا ہو۔

ریحانہ نے بڑی تمناؤں اور آرزوؤں کے ساتھ عظیم کے لیے ایک بے حد مہنگا سوٹ سلوایا تھا۔ قیصر کی شادی کے روز اس نے خود عظیم کو وہ سوٹ پہنایا۔ عظیم کے چاروں طرف گھوم کر اس نے بغور اس کا جائزہ لیا پھر وہ ٹمٹکی باندھ کر اپنے شوہر کی اس تصویر کی طرف دیکھنے لگی جو کمرے کی دیوار سے آویزاں تھیں۔ دونوں باپ بیٹے کی شخصیت کس قدر تعجب کی مشابہت رکھتی تھی۔ ریحانہ کچھ دیر تک اپنے شوہر کی تصویر کو دیکھتی رہی پھر ایک نگاہ اس نے اپنے سامنے کھڑے عظیم پر ڈالی۔

بے اختیار ہو کر وہ آگے بڑھی اور پیار سے عظیم کی پیشانی چوم لی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے  
 کیسے آنسو تھے؟ — خبر نہیں — شاید مرحوم شوہر کی یاد ہو یا — یا  
 بیٹے کی اپنے باپ کی طرح جوان اور توانا ہونے کی خوشی۔ بہر حال اس کے آنسو بہہ  
 رہے تھے۔ عظیم کی پلکیں بھی نم ہو گئی تھیں۔

اسی لمحہ جبکہ وہ دونوں ماں بیٹا اس ماحول میں ڈوبے ہوئے تھے۔ سعادت  
 اندر داخل ہوئے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر وہ ٹھٹھکے پر دونوں ماں بیٹے نے  
 جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھ لیے۔ سعادت اپنے بھائی کی تصویر کو دیکھ کر سب  
 کچھ بھانپ گئے۔ اتنے میں دیکھانہ نے سنبھلتے ہوئے اس گہرے اور جان بیزار  
 سکوت کو توڑا۔

بھائی جان! میں چاہتی ہوں قیصر اور عظیم کی شادی پر سارا خرچہ عظیم اپنے ہاتھ  
 سے کرے تاکہ میرے بچوں کو یہ احساس نہ ہو کہ ان کا باپ ان سے ہمیشہ کے لیے  
 روٹھ چکا ہے۔ آپ کو اس پر کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟  
 سعادت نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھائی! عظیم جب میرے سامنے ہوتا ہے۔ تو  
 میں یہی محسوس کرتا ہوں کہ میرا بھائی اپنے ناطق وجود کے ساتھ میرے سامنے  
 کھڑا ہے۔

تینوں ایک ساتھ ہانپ نکل گئے۔

قیصر کی بات گئی اور خوب دھوم سے گئی۔ سعادت کی کار میں قیصر



دوہا بنا بیٹھا تھا اس کے ساتھ ریحانہ اور عظیم تھے۔ صائمہ کو عظیم نے اپنی گود میں بٹھا رکھا تھا۔ اگلی سیٹ پر سعادت کے ساتھ آسیہ بیٹھی تھی۔ دوسرے بارانیوں کے لیے بس کا انتظام تھا۔

نکاح کے بعد جب قیصر لڑکیوں کے زرخے میں مچھسا ہوا تھا اور اس سے قریب ہی عظیم نوٹ گن گن کر قیصر کی سالیوں کو لاگ دے رہا تھا۔ مذاق کرنیوالی لڑکیوں میں سے کسی نے کہا۔

بے شرم! تم نے تو بڑے بھائی کی منگیتر چھین لی ہے۔

عظیم مقوڑی دیر کو چونکا۔ چہرے پر درندگی اور وحشی جلال چھا گیا۔ پر فوراً ہی وہ ضبط کر گیا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے زبردستی مسکرا دیا۔ وقتی طور پر قیصر کا سر بھی جھک گیا تھا۔ لیکن یہ تو سب کچھ عارضی تھا۔ جلد ہی وہ اپنے چہرے کے سائے نقوش سمیٹ گیا تھا۔

عظیم نے اپنے فرائض خوش اسلوبی سے نبھاتے اور خود اپنے ہاتھوں سے عاصفہ کو قیصر کے لیے بیاہ کر گھر لے آیا۔ دنیا کا بھی عجیب دستور ہے کوئی اپنی دہن بیاہ کر لایا اور کوئی اپنا جنازہ اپنے ہی کندھوں پر اٹھالایا۔ عظیم نے اس حد تک اپنے آپ کو فنا کر دیا تھا کہ عطیہ اور بے بی کے ساتھ مل کر اس نے قیصر اور عاصفہ کی شب عروسی کا پلنگ بھی خود سجایا۔

قیصر نے ساری خوشیاں اپنی جھولی میں سمیٹ لیں۔ اور عظیم کی چھلنی کی طرح چھدی جھولی میں غم ہی غم اور قسارت گرے۔ قیصر زندگی کے دکھوں اور فطرت

کے تیز دھارے کو عبور کر کے ساحل پر جا کھڑا ہوا اور عظیم بچہ منجھار میں ڈوب گیا۔ قیصر خوشیوں کی شہ نشین پر کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔ جبکہ عظیم غموں کی دہلیز پر کھڑا اپنے ناسور جیسے زخموں پر کراہ رہا تھا۔ سماج کے ڈرامے میں قیصر ظالم اور عظیم مظلوم بن گیا۔ زندگی کی بساط اور بازی میں قیصر جیت گیا اور عظیم اپنا سب کچھ ہار کر اپنی جھولی جھاڑتا ہوا کچلے مسے انسان کی طرح آپہن بھرتا ہوا اٹھ گیا۔

عظیم کی حالت اس حواں نصیب فاختہ جیسی تھی جس کے انڈھے کوڑے پی گئے ہوں۔ وہ ہار گیا تھا۔ زندگی کے وسیع میدان میں — لوٹ یا گیا تھا۔ زلیست کے بارونن بازاءوں میں قیصر کی سوہاگ رات جو اس کے لیے کرب اور عسکر رات تھی کسی نہ کسی طرح گزر ہی گئی۔

دوسرے روز عطیہ کی بارات آنا تھی۔ قیصر تو عاصفہ کے پاس اس طرح بیٹھا تھا جیسے مرغی اپنے انڈوں سے نہیں ہلتی اس لیے عظیم کو سارا کام اکیلے ہی کرنا پڑ رہا تھا۔ سعادت اور آسیہ ہر کام میں اس کی مدد کر رہے تھے۔ اکیلے نے صحن میں شامیانہ لگوا یا۔ چنیریں درست کرائیں۔ برتن اور حمام سلیمے سے لگوائے عطیہ کی شادی میں وہ قیصر سے بھی زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔

آخر بارات آئی۔ دن سرگتار ہوا اور سائے بڑھتے رہے۔ نکاح ہوا اور پھر کھانے کے بعد نہ ہستی کی تیاری شروع ہو گئی۔ عطیہ رو رہی تھی۔ دھاڑیں مار مار کر — پہلے وہ آسیہ سے گلے مل کر روتی۔ پھر سعادت اور قیصر سے ملنے کے بعد جب وہ بیکانہ سے گلے مل کر روتی تو ماحول زیادہ ٹمگین ہو گیا تھا۔ دونوں ماں بیٹی رو رہی تھیں اور ننھی



صائمہ عطیہ کی ٹانگوں سے پیٹ کر آنسو بہا رہی تھی۔  
 ماں سے علیحدہ ہونے کے بعد عطیہ نے ادھر ادھر دیکھا اس کی نگاہیں عظیم کو  
 تلاش کر رہی تھیں۔

عظیم؟

جو اس کا باپ بھی تھا اور بھائی بھی۔ جو اس گھر کا ستون بھی تھا اور سہارا بھی مگر  
 وہ سب کی نظروں سے اوجھل اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھا رو رہا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے  
 چھت کی طرف دیکھ رہا تھا اور آنسو اس کی گالوں پر بہتے ہوئے اس کی قمیض کو مہلگو  
 رہے تھے۔

عطیہ ریحانہ اور بے بی کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوئی عظیم نے نگاہیں سیدھی  
 کر کے تینوں کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں خوب سُرخ اور آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔  
 ریحانہ اس کی حالت دیکھ کر وہل گئی۔ عظیم کھڑا ہو گیا۔ عطیہ رو کھڑاتی ہوئی آگے بڑھی اور  
 بھائی کے کندھے پر سر رکھ کر وہ روتے روتے چلا اٹھی۔  
 بھیا! میرے پیارے بھیا۔

ریحانہ نے خود بھی روتے ہوئے دونوں بہن بھائی کو علیحدہ کیا اور سنبھلتے ہوئے  
 عظیم کی پیٹھ سہلا کر کہا۔

بہن کو اپنے ہاتھوں سے دداع کرو بیٹا! تاکہ اسے احساس نہ ہو کہ اس کے ابو۔  
 اس سے آگے کے الفاظ ریحانہ حلق میں ہی پیوست ہو کر رہ گئے تھے۔ عظیم عطیہ کو  
 سہارا دیکر باہر لایا اور ٹپپولوں سے بھی ہوتی کار میں لا بٹھایا۔ بارات رخصت ہو گئی۔

عظیم عطیہ کی جاتی ہوئی کار کو اس وقت تک دیکھنا رہا جب تک وہ نگاہوں سے دھبل نہ ہو گئی۔

عطیہ جا چکی تھی۔ عظیم ریحانہ اور بے بی اداس تھے۔ قیصر پر کوئی اثر نہ تھا وہ ماں کی غفلت اور بھائی کے احترام کو بھول کر عاصفہ کے پاس بیٹھا اس طرح باتیں کر رہا تھا۔ جیسے ان دونوں کو کوئی دیکھ ہی نہ رہا ہو۔

قیصر کی سوہاگ کی وہ دوسری رات مگر عظیم کے لیے وہ دکھوں کی سیاہ رات تھی۔ رات بارہ بجے تک وہ گھر سے باہر رہا۔ پھر آکر بستر میں دبک گیا۔ دوسرے روز عاصفہ کے ماں باپ اسے لینے آ گئے۔ عظیم اور قیصر بھی ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ قیصر کو تو ویسے ہی عاصفہ کے ساتھ جانا تھا اور عظیم عطیہ کو لانے گیا تھا۔ عظیم وہاں رات نہ رہنا چاہتا تھا۔ پر خالہ کے مجبور کرنے پر رُکنا پڑا۔ دوسرے روز وہ عطیہ کو گھر لے گیا۔ قیصر اور عاصفہ بھی اس کے ساتھ آ گئے تھے۔ عاصفہ عظیم کا سامنہ نہ کر پار ہی تھی۔

گنہگار اور مجرم جو تھی۔

قصور وار اور خطا کار جو تھی۔

عظیم خود بھی اس سے اجنبی ہو بیٹھا۔ وہ کسی کی ہو گئی تھی۔ اسے اب اس نگاہ سے دیکھنا ہی گناہ تھا۔ تیسری رات بھی حسب معمول بیقراری اور اضطراب میں گزر گئی گاڑی کی روانگی سے صرف تین گھنٹے قبل عظیم نے ریحانہ پر کراچی جانے کا انکشاف کیا۔ وہ بچا دی پیلی ہو کر رہ گئی۔ عطیہ بھی پاس بیٹھی تھی۔ عظیم جب ماں کے پاس سے ہٹنے لگا تو اس نے دُکھتے لہجے میں کہا۔



یہیں کہیں سر دس کر لو بیٹے! اتنی دُور جانے کی کیا ضرورت ہے میں چاہتی ہوں  
اب تم میری نگاہوں کے سامنے رہو۔

وہیں کھڑے کھڑے عظیم کا سر جھک گیا اور بھاری آواز میں اس نے کہا میرے  
اور آپ کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے امی! قیصر اور عظیم دونوں کی شادی  
ہو گئی ہے۔ خدا کرے یہ دونوں خوش حال زندگی کی ابتدا کریں۔ مجھے اُمید ہے قیصر  
آپ کا خیال رکھیگا۔ میں اب کہیں بھی چلا جاؤں میں مطمئن ہو گا کہ میں اپنے ایک  
عظیم فرض سے سبکدوش ہو گیا ہوں۔ اور پھر میں کوئی ہمیشہ کے لیے تھوڑا ہی جا رہا  
ہوں امی!

لوگ تو پیٹ کی خاطر ملک سے باہر اتنے اتنے برس گزار آتے ہیں۔ میں تو صرف  
کراچی ہی جا رہا ہوں۔

دیکھنا اس کی باتوں سے اور زیادہ زخمی ہو گئی تھی۔ منت کرنے کے انداز میں  
اس نے عظیم سے کہا — تم نے آج تک میری کوئی بات نہیں ٹالی بیٹے! مجھے  
تم جیسے بیٹے پر فخر ہے۔ صرف ایک بات اور مان لو پھر زندگی بھر میں تم سے کچھ نہ کہوں گی  
میرے بیٹے!

عظیم سب کچھ سمجھنا اور جان رہا تھا۔ وہ ان باتوں میں نہ پڑنا چاہتا تھا پر ماں کی  
تسلی بھی تو ضروری تھی اس لیے اسے بولنا پڑا۔

امی! شادی کے علاوہ آپ میرا سر بھی مانگیں تو انکار نہ کروں گا۔  
دیکھنا کہیں کھوہ کر رہ گئی اور دکھ سے کہا۔

میرے بیٹے! اندھیری رات کا وہ مسافر جس کے پاس اپنی دہیری کے لیے صرف ایک ہی چراغ ہو۔ وہ ہوا کے تیز جھونکوں میں بھی اسے بکھنے نہیں دیتا خواہ اس کشمکش میں اس کے ہاتھ ہی کیوں نہ جل جائیں۔ تم میری زندگی کا چراغ ہو عظیم میں چاہتی ہوں اس گھر کے آگن میں تمہارے بچے ناچیں کو دیں۔

میرے لال! میں کیسے برداشت کر سکتی ہوں کہ میں سکون سے گھر پڑی رہوں اور میرا بیٹا۔ سکون، شانتی اور آسودگی کی تلاش میں دھکے کھاتا پھرے۔ بس میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں بیٹے۔ اس کے علاوہ میری کوئی آرزو نہیں ہے۔

میں کوئی چراغ سحری نہیں ہوں امی! آپ دیکھیں گی ایک روز میں تانباک آفتاب بن کر طلوع ہونگا۔ جس کی سنہری کرنیں ہمیشہ آپ کے پاؤں چومتی رہیں گی۔

خدا کرے ایسا ہی ہو بیٹے۔ پر تم شادی تو کر لونا۔ آسیہ کی بھی مرضی ہے اور سعادت بھائی بھی اس پر خوش ہیں۔ آسیہ اگر عاصفہ سے خوبصورت نہیں تو اس سے کم بھی نہیں ہے بیٹے!

عظیم کو ایک اور بہانہ مل گیا۔

امی! ابھی تو اسی پڑھ رہی ہے۔ جب وہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کرے گی دیکھا جائیگا۔ ریحانہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

جب وہ ڈاکٹری کرے پھر تم اس سے شادی کر لو گے نا۔ انکار نہ کرنا بیٹے میرا دل ٹوٹ جائیگا۔ مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں رہی کہ تمہیں اکیلا بھٹکتے دیکھ سکوں۔ عظیم نے ریحانہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مٹی مٹی مٹی تھی اس کا دل پہنچ گیا۔



ماں جو تھی — اور ماں بھی —

وہ ماں ؟

جسے وہ دنیا کی ہر چیز سے افضل و عزیز جانتا تھا۔ اس کا سر آپ ہی آپ جھک گیا اور ہلکے سے اس نے کہہ دیا۔

ہاں امی !

ریحانہ آگے بڑھی اور عظیم کو لپٹا کر بڑی تیزی سے اس کی پیشانی، گال اور سر چوم لیا۔ پاس بیٹھی عطیہ اور بے بی مسکرا رہی تھیں۔ ریحانہ تیزی سے اپنے کمرے میں داخل ہوتی ایک اٹھی سے کوئی چیز نکالی اور اس مٹھی میں دبا کر وہ سعادت کے مکان کی طرف چلی گئی۔

ریحانہ تھوڑی دیر بعد لوٹی۔ اس کے ساتھ سعادت بھی تھے۔ دونوں مسکرا رہے تھے۔ سعادت نے آتے ہی سونے کی ایک قیمتی اور وزنی انگوٹھی عظیم کو پہنا دی۔ عظیم شش و پنج میں ہی پڑا تھا کہ ریحانہ بول پڑی۔

میں آئیہ کو منگنی کی انگوٹھی پہنا آتی ہوں بیٹے ! اور یہ بھائی جان کی طرف سے تمہاری منگنی کی انگوٹھی ہے۔ انگوٹھی پہنا کر سعادت نے عظیم کو لپٹا لیا۔

تم نے میری بات رکھ لی ہے بیٹے ! میں بے حد خوش ہوں — اپنے گھر کے لان میں کھڑی آئیہ یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ عظیم اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور اپنے کپڑے سمیٹ کر اپنے اٹھی میں جمانے لگا۔ ریحانہ نے منت کرنے کے

وہ پھر کراچی جا رہا ہے۔ بھائی جان۔ آپ ہی اسے روکیں۔ شاید آپ کی بات مان جائے۔ سعادت فوراً سنجیدہ ہونگے۔

آپ اس سے زیادہ نہ الجھیں بھابی! فی الحال اسے جانے دیں۔ وہ بڑا حساس بچہ ہے یہاں عاصفہ کی موجودگی میں یوں ہی بچارہ کڑھتا اور جلتا رہے گا۔  
عظیم اپنا اٹیچی اٹھاتے باہر آگیا۔ ریحانہ نے بڑی بچاڑگی سے پوچھا۔ قیصر سے ملے ہو بیٹے!

عظیم نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے کمرے میں ہے امی! میں وہاں جا کر کس طرح اسے مل سکتا ہوں۔ ریحانہ نے دیہیں کھڑے کھڑے قیصر کو آواز دی پہلی آواز پر قیصر نے کوئی جواب نہ دیا۔ ریحانہ نے دوسری بار اسے پکارا۔ قیصر نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ وہ عاصفہ کے پاس جو بیٹھا ہوا تھا۔ عظیم کے چہرے پر وہی پرانی درندگی اور وحشی جلال چھا گیا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا۔ دندناتا ہوا قیصر کے کمرے میں داخل اور اس کی وہ زبان پکڑ کر کاٹ دے جس سے وہ اس کی ماں کی پکار کا جواب نہ دے رہا تھا۔

ریحانہ خود بھی عظیم کی حالت دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی تھی۔ لہذا اس نے قیصری بارہ نزد سے قیصر کو پکارا۔ قیصری بارہ قیصر اپنے کمرے کے دروازے پر آیا اور پھکی سی آواز میں اکھڑے لہجے کے ساتھ پوچھا۔

کیا ہے امی!

ریحانہ نے چوٹ کھاتے لہجے میں کہا۔



عظیم جا رہا ہے۔ اسے گاڑی تو چڑھا آؤ۔  
قیصر باہر آیا اور اچاٹ سے ہجے میں عظیم سے پوچھا۔  
چھٹی ختم ہو گئی آپ کی؟

عظیم نے کہا جانے والی نگاہوں سے اُسکی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
امی نے یوں ہی تمہیں تین بار پکار لیا ہے۔ تمہیں میرے ساتھ اسٹیشن جانے کی  
ضرورت نہیں۔ تمہارا وقت ضائع ہوگا۔ جاؤ اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔ انکل مجھے اسٹیشن  
چھوڑ آئیں گے۔ یہ ایک تمللا دینے والی ضرب اور چوٹ تھی جو عظیم نے قیصر پر لگائی تھی۔  
لیکن وہ احق کچھ سمجھا ہی نہ تھا۔ عاصفہ کے چکر میں وہ اپنا آپ اور دوسروں تک کو  
بھول جو گیا تھا۔

عظیم نے سعادت کا ہاتھ پکڑ لیا۔ آئیے انکل چلیں۔ کسی کو بھی کچھ کہنے کی جرأت نہ  
ہوتی۔ قیصر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ریحانہ، عطیہ اور بے بی ان دونوں کے پیچھے پیچھے چلنے  
لگیں۔ ان کا رخ سعادت کے مکان کی طرف تھا۔

آسیہ لان میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ عظیم کو سب کے ساتھ اس نے جو ادھر آتے دیکھا  
فوراً اکھڑی ہو گئی اور اپنی ساڑھی کا پلوٹنہ میں لیتی ہوئی وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔  
سعادت نے اسے پکارا۔

آسی! بات سنو بیٹی!  
آسیہ جہاں تھی وہیں رک گئی۔

سعادت آگے بڑھے ایک ہاتھ سے انہوں نے آسیہ کا کانپتا ہوا گورا سر رخ ہاتھ

پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ میں انہوں نے غلیم کا ہاتھ تھامتے ہوئے آسید سے کہا۔  
 اسی بیٹے! آج سے تم غلیم کی ہو۔ تم دونوں آپس میں خط و کتابت کرنا چاہو تو مجھے  
 کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ پس تمہیں اس بات کی بھی اجازت دیتا ہوں کہ آئندہ سے  
 تم اپنا نام آسید کے بجائے آسید غلیم لکھو مجھے خوشی ہوگی۔

آسید کا سر جھک گیا تھا اور نازک جسم اس طرح کپکپا رہا تھا جیسے کوئی نوزائیدہ  
 نونہال جس کی ٹہنیاں ابھی کچی اور نازک ہوں اور تیز ہواؤں میں لرز کانپ ہو رہی ہیں  
 سعادت نے دیکھنا سے کہا۔

بھابی آپ لوگ گھر ہی رہیں۔ میں اور آسید غلیم کو گاڑی چڑھا آتے ہیں۔  
 دیکھنا غلیم کو لپٹا کر پیار کرنے لگی۔ سعادت نے گھیراج سے کار نکالی۔ غلیم اور آسید  
 کو کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا اور دونوں چپ چاپ سعادت مند بچوں کی طرح  
 کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ سعادت نے کار نکال کر اسٹیشن جانے والی سڑک پر  
 ڈال دی۔ دیکھنا وہیں کھڑی غلیم کو نگاہوں سے اوجھل ہوتے دیکھ رہی تھی۔ کار  
 کے اندر بیٹھی ہوتی آسید بار بار چوڑنگا ہوں سے غلیم کو دیکھ رہی تھی اب وہ اس کا  
 منگیتر اور منسوب ہو تھا۔





عظیم پھر کراچی جیسے پرشور اور باد و برق شہر میں آگیا تھا۔ مگر اس کے دل کا شہر اب بھی سنسان اور دیوان تھا۔ بھاتی کے لگاتے ہوتے چر کے اور گھاؤ کو وہ بھول جانا چاہتا تھا۔ پرداغ ایسا تھا مٹ نہ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اکثر مصروف رکھنے کی کوشش کرتا لیکن ذہن پھر بھی منتشر ہو جاتا تھا۔

قیصر اور علیہ کی شادی میں ہنسنے اور قہقہے لگانے والا عظیم پھر کہیں کھوہ گیا تھا۔ بالکل اس سرسام زدہ انسان کی طرح جس نے غم و حسرت کی نقاب اوڑھ لی ہو۔ یا اس کو بآتش روح کی طرح جیسے تاریکی کے پردوں میں ملفوف کر دیا گیا ہو۔ وہ پھر بھٹکنے پر مجبور تھا۔ غول سے جدا پرندے کی طرح۔ پنجر کے مفوم گیت کی طرح۔ وہ اپنے تشخص تک کو بھول گیا تھا کہ کوئی اس کا مونہں تنہائی نہ تھا۔ وقتی طور پر آئیہ کو اس کا ساتھی ضرور بنا دیا گیا تھا۔ لیکن کراچی آکر اس کے دل میں کمل کے لیے مدھم مدھم اور

میٹھی میٹھی سی آنچ ضرور ابھری تھی۔ سری لنکا کی قدیم لڑکیوں کی طرح وہ مقدس، خوبصورت، دلکش اور اسرار خیز لڑکی عاصیہ کے صبر شاید اس کے دل کو بھاگتی تھی۔ کراچی آکر اس نے پہلی رات بڑی کرب اور تکلیف کی حالت میں گزادی۔ وہ رہ کر ماں کا اداس اور مغموم چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا تھا اور وہ خود بھی افسردہ اور مغموم ہو جاتا تھا۔ اس دریا کی طرح جسے سمندر نصیب نہ ہوا ہو۔

دوسرے روز جبکہ وہ آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ مکمل جھونپڑی میں داخل ہوتی۔ اس کا چہرہ پھول کی طرح خوشگوار اور اناس کی طرح رس دار ہو رہا تھا۔ پکے ہوئے سوڑے کی طرح اس کا جسم بھرا ہوا درس دار تھا۔ عظیم کے پاس آکر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

آپ گھر سے کب آتے؟

عظیم نے حیرت سے پوچھا۔

تمہیں کیسے علم ہوا میں گھر گیا تھا؟

میں پچھلے دو دنوں سے لگاتار آپ کا پتہ کرنے آتی رہی ہوں۔ آپ کے ساتھی نے بتایا تھا کہ آپ گھر گئے ہیں۔ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

آپ کا ساتھی کہاں گیا؟

عظیم جو بوٹ پہن رہا تھا۔ تسے باندھ کر سیدھا کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

وہ اپنے کام پر جا چکا ہے۔

کل تھوڑی دیر تک بڑے شوق سے عظیم کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کی بہار کی صبح



کے پر شمیم ہوا کے پہلے جھونکے جیسی آواز سنائی دی ۔  
میں آپ سے ایک خوش خبری کہنے آئی ہوں ۔  
کیسی خوش خبری ۔

میرے ابو نے مجھے آپ کو اپنانے کی اجازت دے دی ہے ۔  
عظیم نے چونک کر پوچھا ۔ سچ ؟

کمل اس کے سامنے کھڑی ہوتی ہوتی بولی ۔  
قسم خدا پاک کی میرے ابو رضامند ہو گئے ہیں ۔ عظیم نے مسکراتے ہوئے اپنے  
دونوں بازو پھیلاؤ دیتے اور چہکتی ہوتی آواز میں کہا ۔  
اسی خوشی میں میرے گلے لگ جاؤ ۔

کمل ذرا جھکی پھر بھاگ کر اپنی پوری قوت کے ساتھ وہ عظیم سے لپٹ گئی جیسے  
سرحد کے ہنزہ اور سوات دریا آپس میں لپٹتے ہیں ۔ جیسے پنجاب کے جہلم اور چناب  
ایک دوسرے سے ملتے ہیں ۔ جیسے بلوچستان کے اوڑک کے چشمے کا پانی سیب  
کے باغات سے لنگیر ہوتا ہے جیسے سندھ کی ہب ندی بھاگتی کودتی اور سانپ کی  
طرح بل کھاتی ہوتی سمند کی گود میں گرتی ہے ۔ ان کے چاروں بازو ایک دوسرے  
میں یوں پیوست ہو گئے تھے جیسے جیسے پنجاب ، سندھ ، سرحد اور بلوچستان چاروں  
صوبے اپنی اپنی انفرادیت کو بھول کر پوری یکجہتی اور اتحاد سے کام لیکر اپنے ضمیر کی  
گہرائیوں سے مجتمع اور متحد ہو کر صرف ایک اکائی اور عدد متبائن بن گئے ہوں ۔  
کمل علیحدہ ہوتی ہوتی بولی ۔

آپ آج آفس کے بعد سیدھے ہمارے گھر آئیں۔ میرے ابو آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے تمہارا گھر ہی نہیں دیکھا ہوا۔

میں میرا لویڈر ٹاؤر کے پاس آپ کا انتظار کروں گی۔ وہاں سے میں خود آپ کو اپنے گھر لے جاؤں گی۔ دیر نہ کیجئے گا۔ یہ نہ ہو شام تک میں وہیں سکڑتی رہوں۔

عظیم مسکرا رہا تھا۔ میں ضرور آؤں گا۔

مجھے مبارک باد بھی دیکھتے۔

کیسی

میں بی۔ اے کر گئی ہوں۔ سیکنڈ کلاس آتی ہے۔

دیری گڈ

آؤ پھر چلیں مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔

کل اٹھ کر اس کے ساتھ ہوئی۔ الیکٹرک پیلانی کارپوریشن تک دونوں اکٹھے آئے وہاں سے رکشے میں بیٹھ کر کل بائیں ہاتھ کی گاڑی کی طرف چلی گئی۔ اور عظیم پوگو گراؤنڈ کے ساتھ ساتھ دائیں ہاتھ اپنے آفس کی طرف چلا گیا۔

آفس کا ابھی وقت نہ ہوا تھا۔ بہر حال آفس کا سارا شان اپنی اپنی سیٹوں پر پر بیٹھا تھا۔ عظیم کو اپنی کرسی پر بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ فرانسس آگیا۔ آتے ہی وہ عظیم سے بھلکیر ہوا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

کیسے ہو بیٹے! کب آتے ہو۔ تمہارے گھر کے حالات کیسے ہیں۔ فرانسس ایک ہی سانس میں کئی سوال کر گیا۔ عظیم ابھی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ وہ پھر لولا۔



تمہاری غیر موجودگی میں میرا کام بھی بن گیا۔

کیسا کام؟

بینک کی لاہور برانچ میں اکاؤنٹنٹ کی سیٹ خالی ہو گئی ہے اور میں نے وہاں اپنی ٹرانسفر کی ایپلیکیشن دے دی ہے۔ اُمید ہے میرا کام ہو جائے گا۔ میں دل کا مریض ہوں اور کراچی کی ملکین سمندری ہوا میرے جسم کے خمیر سے انطباق نہیں کر رہی۔

فرانسس سے علیحدہ ہو کر عظیم نے ایک بار آفس کا جائزہ لیا۔ پورا ماحول بدلا ہوا تھا۔ کلرک قیمتی اور اچلے پھرے پہنے کچھ اس طور اور شان سے اپنی سیٹوں پر بیٹھے تھے گویا آفس کام کرنے نہیں کسی فلم کی شوٹنگ میں حصہ لینے آئے ہوں۔ ورنہ یہ وہی کلرک تھے جو میلے اور استری کیے بغیر کپڑے بھی آفس پہن آیا کرتے تھے۔ عظیم نے اپنا اور فرانسس کا جائزہ لیا۔ دونوں کے وہی پُرانے کپڑے تھے۔ فرانسس کی طرف دیکھتے ہوئے عظیم نے حیرت سے پوچھا۔

یہ آفس کا ماحول کچھ بدل نہیں گیا؟

ہاں بدل گیا ہے؟

کتنی وجہ ہے یا لیں ہی۔

بہت بڑی وجہ ہے۔ ابھی چند لمحوں تک تم خود ہی جان جاؤ گے۔

پر کیسے؟

آفس میں ایک بے حد حسین ٹیلیفون آپریٹر کی آتی ہے اور یہ سارے لوگ

سب اسے پھانسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی لیے تو روزانہ بن سنور کر آتے ہیں۔ جوان تو جوان۔ بوڑھے بھی جو خود جوان بیٹیوں کے باپ ہیں اور جن کے منہ سے دانت تک گرنا شروع ہو گئے ہیں وہ بھی اس تاریک اور سیاہ کارنامے میں حصہ لے رہے ہیں۔ ویسے لڑکی کے آنے سے ایک فائدہ ضرور ہوا ہے۔  
کیسا فائدہ۔

آفس کا سارا اسٹاف خوب اجلا اور اسمارٹ ہو کر آفس میں آنے لگا ہے اور یوں ایک طرح سے دفتر میں دفتریت آگئی ہے۔ عظیم صرف مسکرا کر رہ گیا۔ فرانسس نے پھر پوچھا۔

بھائی اور بہن کی شادی کر آتے ہو۔

عظیم چونک سا گیا۔ جی ہاں۔

اور اپنی بے فرانسس کی آواز میں دکھ اور ہمدردی تھی۔

عظیم کا سر جھک گیا اور چہرہ ماند پڑا گیا۔ شاید پرانی یادیں پھر ہجوم کر آئی تھیں کافی دیر تک وہ کوئی بات نہ کر سکا۔ بس سر جھکاتے کرسی پر بیٹھا رہا۔ فرانسس بالکل بچھے ہوئے چراغ کی طرح افسردہ انداز میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر سنبھلتا ہوا بولا۔  
عظیم! انسانی زندگی شطرنج کا ایک کھیل ہے۔ ہر کوئی اس کی بساط کے مہرے پر داغ لگاتا ہے۔ کسی کی مار ہوتی ہے اور کوئی جیت جاتا ہے۔ ہمت نہ ہارو۔ نئے دلوں کے ساتھ دوبارہ اٹھو اور پوری قوت کے ساتھ تقدیر کے بھاگتے تو سن کی عنان قابو میں کر کے رونما ہونے والے حالات کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دو



عظیم کا سر پھر بھی جھکا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ فرانسس نے بات کا رخ بدلا۔

آج آفس کے بعد تم میرے ساتھ میرے گھر چلنا۔ میں تمہارے ساتھ تمہاری زندگی کا ایک اہم فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ عظیم چونک پڑا اور کہیں دُور سے بولا۔  
آج تو میں نے اپنے ایک شناسا سے آفس کے بعد میری ریڈ ٹاؤر ملنے کا وعدہ کیا ہے۔

فرانسس نے لاپرواہی سے کہا۔ تو کیا ہوا۔ اسے میری ریڈ ٹاؤر مل کر میرے ساتھ چلنے جانا۔

عظیم جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ رُک گیا۔ آفس کا پورا شاف نگاہیں اٹھا اٹھا کر آفس کے بیرونی گیٹ کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بے حد حسین لڑکی آفس میں داخل ہوئی۔ فرانسس نے عظیم کا بازو پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔ یہ ہے وہ لڑکی۔ بچپان میں نے خبر نہیں کس مجبوری کے تحت سروس کی ہوگی اور یہ لوگ اس کے پیچھے یوں پڑ گئے ہیں۔ جیسے بکری کے پیچھے بھیڑیا۔

لڑکی نے کس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ عظیم کی مینر کے ساتھ ہی وہ اپنے لکڑی کے کین میں داخل ہوئی اور اپنے کام میں لگ گئی فرانسس اور عظیم بھی اپنا دُورہ کام کرنے لگے تھے۔

آفس ٹائم کے بعد عظیم نے پچھنے کی انتہائی کوشش پر فرانسس نے زبردستی اسے اپنی موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھالیا اور اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ میری ریڈ ٹاؤر آکر فرانسس

نے موٹر سائیکل روکی اور عظیم سے کہا۔

مل لوکس سے ملنا ہے؟

عظیم نیچے اتر اس نے دیکھا کل ایک طرف کھڑی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔  
کل نے بھی عظیم کو دیکھ لیا تھا اور وہ بھی تیزی سے عظیم کی طرف بڑھی تھی۔ قبل اس کے  
عظیم کل سے کوئی بات کرتا اسے اپنے پیچھے سے فرانسس کی آواز سنائی دی۔

کل بیٹی! تم یہاں؟

عظیم چونک سا پڑا۔ کل عظیم کے پاس سے گزرتی ہوئی آگے بڑھی اور فرانسس  
سے مخاطب ہوئی۔

ابو! آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔

فرانسس موٹر سائیکل سے اترتے ہوئے عظیم کی طرف اشارہ کر کے بولے  
بیٹی! میں اس لڑکے کو ساتھ لایا ہوں جس سے میں تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں۔  
اب تم اسے دیکھ کر اندازہ لگا سکتی ہوں کہ آیا شخصیت میں وہ لڑکا اچھا ہے جسے  
تم پسند کر چکی ہو یا یہ جو تمہارے لیے میرا انتخاب ہے۔

کل سکرا رہی تھی۔ ابو جی! یہ وہی تو ہیں جنہیں میں پسند کر چکی ہوں۔ انہیں  
میں نے آج آفس کے بعد ڈاؤر پر ملنے کو کہا تھا۔ آج میں انہیں آپ کے پاس لا رہی  
تھی۔ آپ نے خود ہی تو انہیں آج گھر لانے کو کہا تھا۔

فرانسس نے ہنستے ہوئے کہا۔ بیٹی! اگر یہ عظیم تمہاری پسند ہے تو میں تمہارے  
انتخاب کی داد دیتا ہوں۔ میں عظیم کو ایک عرصہ سے جانتا ہوں۔ اور کھیلے کئی ماہ سے



میں اسے تمہارے لیے منتخب کر چکا ہوں۔ پھر انہوں نے عظیم سے کہا۔  
 عظیم! میں جا رہا ہوں بیٹے! تم مکمل کو لیکر رکشے میں آ جاؤ۔ نہیں تو ٹھہرنا کھٹے  
 ہی چلتے ہیں۔ فرانسس نے خود ایک رکشہ میں دونوں کو بٹھایا۔ پھر وہ اپنے موٹر سائیکل  
 پر بیٹھے اور کیمڈی کی طرف بڑھ گئے۔

تینوں ایک ساتھ دو کمرہ کے ایک صاف ستھرے مکان میں داخل ہوئے۔  
 جسے خوب اچھی طرح ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ سامنے والے کمرے میں چھوٹی سی ایک  
 لڑکی بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ فرانسس نے اس سے عظیم کا تعارف کرایا۔  
 یہ میری چھوٹی بیٹی سیبل ہے۔ تیسری میں پڑھتی ہے۔ فرانسس رک گئے اور  
 دوسرے کمرے کی طرف جاتی ہوئی مکمل کو آواز دی۔

مکمل ادھر آؤ بیٹی!

مکمل لمباتی شرماتی ہوئی ان کے سامنے اکھڑی ہوئی۔ فرانسس نے اسے اپنے  
 سامنے عظیم کے ساتھ صوفہ پر بیٹھنے کو اور وہ چپ چاپ وہاں بیٹھ گئی۔ اس کا نازک  
 جسم کپکپا رہا تھا اور سر جھکا ہوا تھا۔ پھر فرانسس کی آواز اس کی سماعت سے ٹکراتی۔  
 مکمل! میری بیٹی! آج سے عظیم تمہارا ہے۔ تم دونوں آپس میں مل کر کوئی فیصلہ  
 کرو اور جب تم دونوں کا ارادہ ہو گا میں تمہاری شادی کر دوں گا۔ میں تمہیں اس بات  
 کی بھی اجازت دیتا ہوں تم جب اور جہاں چاہو عظیم کے ساتھ گھوم پھر سکتی ہو۔ تمہیں  
 عظیم سے ملنے کی مکمل آزادی ہے۔ اس لیے کہ مجھے عظیم پر پورا اعتماد اور بھروسہ ہے۔  
 میں خوش ہوں تم نے اپنے لیے بہترین ساتھی کا انتخاب کیا ہے۔

کل نے جواب نہ دیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ تاہم اندر ہی اندر وہ خوشیوں کے بے پناہ ہجوم میں گھری ہوئی تھی۔ عظیم بھی سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ فرانسس پھر بولا۔

اب اٹھو بیٹی! سب کے لیے چائے لاؤ۔ ساتھ کچھ کھانے کا بھی انتظام کر لو۔ کھل اٹھ کر باہر نکل گئی۔ فرانسس اور عظیم آپس میں باتیں کرنے لگے۔

---





دن گذرتے رہے۔ دفتر میں دفتریات کی رنگینی اس ٹیلیفون پر پڑی اور عشرت کی وجہ سے بڑھتی ہی چلی گئی تھی۔ صرف فرانس اور عظیم ہی ایسی ہستیاں تھیں۔ جن پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ اور وہ اپنے پہلے ماحول میں ہی خوش تھے۔ عظیم کی مینز پر جبکہ پہلے کوئی آیا ہی نہ کرتا تھا اب ہر وقت کوئی نہ کوئی ضرور بیٹھا رہتا تھا۔ کیونکہ عشرت کا کھین اس کے برابر میں تھا اور وہاں بیٹھ کر اسے آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔

ایک روز دس بجے کے قریب عظیم نئی خریدی جانے والی اسٹیشنری کا اندراج رجسٹر میں کر رہا تھا کہ کسی نے اسے نہایت میٹھی اور باریک نسوانی آواز میں پکارا۔  
عظیم بھائی!

عظیم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے عشرت کھڑی اس سے مخاطب تھی۔ عظیم کچھ کہنے والا تھا کہ عشرت پھر بول پڑی۔

ایک پنسل دے دیجئے !

عظیم اٹھا اور کینٹ سے پنسل نکال دی۔ پنسل تھامتے ہوئے عشرت نے  
بڑے پُرسوز اور دل فگار لہجے میں پوچھا۔

آپ نے اپنے آپ کو کیوں نہیں بدلا ؟  
عظیم بدحواس سا ہو گیا۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔  
آپ آفس کی پہلی اور موجودہ حالت میں کوئی فرق محسوس کرتے ہیں ؟  
ہاں کافی تبدیلی ہے۔

اور آپ اس سے کیوں متاثر نہیں ہوتے۔  
بجھی ہوئی سی آواز میں عظیم بولا۔ گھر پر میری اپنی جوان بہن بھی ہے۔ ایسا کرتے  
وقت مجھے اس کا خیال بھی اپنے ذہن میں رکھنا چاہیئے۔  
دُکھی لہجے میں عشرت نے پوچھا۔ کیا ان لوگوں میں سے کسی کی بھی گھر پر جوان  
بہن نہیں ہے۔

سب کی ہونگی۔ پر اپنے اپنے سوچنے کا انداز ہے۔ اور اس بیسویں صدی  
کے لوگوں میں سے نوے فیصد لوگوں کا ضمیر اگر مردہ نہیں تو زنگ آلود ضرور ہو چکا ہے  
تمہارے ابو کیا کرتے ہیں۔

مر چکے ہیں۔

کوئی بھائی نہیں۔

کوئی بھی نہیں۔ اس بھری دنیا میں اپنی بیوہ ماں کا میں واحد سہارا ہوں پر پرائے



ہاں ابھی تک کسی لڑکی کے لیے سروس کرنے کا ماحول سازگار نہیں جبکہ دوسری  
 قومیں چاند میں نئی بستیاں آباد کرنے کی سوچ رہی ہیں۔ ہم اپنے ذہن ہی صاف  
 نہیں کر سکے۔ اس آفس کا ماحول بھی آپ کے سامنے ہے۔ ہر کوئی غلط نگاہ سے  
 دیکھتا ہے۔ مگر فرانس صاحب اور آپ کی موجودگی کے باعث میں اپنے آپ  
 میں تقویت محسوس کرتی ہوں۔ اس لیے کہ فرانس ایک جوان بیٹی نے باپ اور  
 آپ ایک جوان بہن کے بھائی ہیں اور میں وہ بد نصیب ہوں جس کا نہ کوئی باپ  
 اور نہ بھائی ہے۔ عشرت کی آنکھوں کے کئی قطرے گر کر عظیم کے سامنے میز پر  
 بکھر گئے۔

عظیم جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ چپڑا سی آیا اور نیلے رنگ کا ایک لفافہ عظیم  
 کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

آپ کا خط

عظیم نے خط الٹ پلٹ کر دیکھا۔ رکیانہ کا خط تھا۔ کھول کر اس نے پڑھا اور  
 ایک دم اس اور افسردہ ہو گیا۔ بالکل بچھے ہوئے چسپاں اور ٹوٹے ہوئے شیشے  
 کی طرح خبر نہیں کیا لکھا تھا خط میں۔ فرانس اپنے کام میں مصروف تھے لہذا انہوں  
 نے کوئی دھیان نہ دیا۔ عظیم اس وقت چونکا جب بچہ میٹھی اور سریلی آواز اس کے  
 کانوں میں پڑی۔

بھیا!

وہ سنبھل گیا۔ سامنے عشرت کھڑی تھی۔ کیا بات ہے بھیا!

عظیم نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ٹالنا چاہا۔ فرانسس بھی اب ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اور بڑی شفقت سے پوچھا۔  
کس کا خط ہے بیٹے!

امی کا

خیریت ہے نا؟

کانپتی آوازیں عظیم نے کہا۔ میرے گھر کی حالات خراب ہو گئے ہیں۔ میرے چھوٹے بھائی کی بیوی میری ماں اور چھوٹی بہن کو تنگ کرنے لگی ہے اور اس نے ان دونوں کا جینا مشکل اور بیزار کر دیا ہے۔ پہلے بھی ایسا ہی ایک خط آچکا ہے۔ عظیم کی آواز میں ڈوب گئی۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میرا چھوٹا بھائی امی سے بغاوت اور ہرکشی کر رہا ہے۔

فرانسس اٹھ کر عظیم کے پاس آئے اور اس کے ہاتھ سے خط لیتے ہوئے پوچھا میں پڑھ سکتا ہوں۔

آپ سے کیا پردہ؟

فرانسس نے خط پڑھا اور افسردہ سا ہو گیا۔ پھر عظیم کی بیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

تم فکر مند کیوں ہوتے ہو بیٹے! تم دو ماں بیٹی کو یہاں بلا لو۔ ہمارے پاس دو کمرے ہیں ایک تم لے لینا دوسرا ہم تینوں کے لیے کافی ہے۔ عظیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔



ابھی نہیں۔ میں قیصر کو خط مکھونگا۔ میں اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر جگاؤں گا۔  
میں اسے بتاؤں گا جس رشتے سے وہ منہ موڑ رہا ہے وہ ایسا نہیں جسے بیوی کی ہر  
جھوٹی سچی مان کر کچے دھاگے کی طرح توڑ دیا جائے اگر وہ سنبھل گیا تو —  
تو ٹھیک۔

ورنہ میں؟ — میں اس سے زندگی کی ہر خوشی چھین لوں گا۔ اگر میں ایک  
مشفق باپ کی طرح اپنا خون دیکر ایک نو نہال کی طرح اس کی آبیاری کر سکتا ہوں  
تو ایک بے رحم باغبان کی طرح اسے زہر پلایا پودا جان کر اسے کاٹ بھی سکتا ہوں۔  
اس نے میری زندگی کو تلخ بنایا اور میں خاموش رہا۔ اپنے بڑے بھائی کی زندگی  
میں زہر گھول دیا۔ پر میں نے زبان نہ کھولی۔ اسے جھوٹا جان کر اس کی خوشی کے آگے  
جھک کر اپنا آپ قربان کر دیا۔ میرے ہاتھ سے اس نے پھول چھین کر مجھے کانٹوں  
الٹھا۔ اور میں اسے بھی چھوٹے بھائی کی راحت جان کر پی گیا۔

لیکن اب — اب وہ میری ذات سے نکل کر ایک ایسی  
ہستی کو دکھ دے رہا ہے جسے میں نے ہمیشہ اپنی زندگی سے عزیز جانا ہے اور  
وہ میری ماں ہے — ماں جس کے قدموں میں میری جنت ہے۔  
میں — میں اس کی قیصر کی ہستی ہی مٹاؤں گا جو میری ماں سے بغاوت  
اور سرکشی کر رہا ہے — عشرت نے پانی کا گلاس لا کر اس کے سامنے  
رکھ دیا اور بڑی ہمدردی سے کہا۔

پانی پی لو بھیا۔ اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ غلیم نے پانی کے دو گھونٹ پیے اور

گلاس عشرت کو ٹوٹا دیا۔ فرانس نے عظیم کی پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔  
 جذباتی نہ بنو بیٹے! حالات ایک روز تمہارے حق میں ضرور پلٹا کھائیں گے۔  
 عظیم سنبھل گیا اور اپنے آفس کے کام میں کھوہ گیا۔

دو ہفتے بڑے پرسکون گزر گئے۔ عظیم نے ایک سخت خط قیصر کو لکھا جس کا  
 ابھی تک اسے کوئی جواب نہ ملا تھا۔ ایک روز عظیم آفس آیا تو فرانس آفس سے  
 غائب تھے۔ حالانکہ وہ آفس ہمیشہ اس سے پہلے آجایا کرتے تھے۔ عظیم دس بجے  
 تک ان کا انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے چپڑاسی سے ان کے متعلق پوچھا پراس نے بھی  
 لاعلمی کا اظہار کر دیا۔

عظیم اپنے روزمرہ کے کاموں میں کھوہ گیا۔ بارہ بجے کے قریب جب آفس کی  
 ڈاک آئی تو چپڑاسی اس کے میز پر دو لفافے رکھ گیا۔  
 آپ کا خط اور تار!

عظیم نے پہلے تار کا لفافہ جلدی جلدی کھول کر تار پڑی۔ ریجانہ تین دن بعد تیز رو  
 سے کراچی آرہی تھی۔ اس نے بڑی بے چینی سے دوسرا لفافہ کھولا۔ وہ ریجانہ کا خط  
 تھا۔ عظیم پڑھنے لگا۔ ریجانہ، صائمہ اور عطیہ کراچی آرہی تھیں۔ ریجانہ اور صائمہ قیصر کے  
 سلوک سے تنگ آکر مستقلاً عظیم کے پاس رہنے کے لیے آرہی تھیں جبکہ عطیہ بھائی سے  
 ملنے ان کے ساتھ آرہی تھی۔ عظیم اداس اور پشیمردہ سا ہو گیا۔ تاہم دونوں لفافے جیب  
 میں ڈال کر وہ پھر آفس ورک کرنے لگا۔

کوئی آدھ گھنٹہ بعد اسے ایک مانوس اور شناساسی نسوانی آواز سنائی دی اس نے



چونک کہ جب آفس کے گیٹ کی طرف دیکھا تو وہاں کل کھڑی تھی اور چوکیدار سے عظیم کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ عظیم کھڑا ہو گیا اور اشارے سے کل کو اپنی طرف بلایا۔ کل تیز قدم اٹھاتی ہوئی عظیم کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ عظیم نے اپنے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

بیٹھو!

کل بیٹھ گئی۔

عظیم نے دیکھا کل کا چہرہ اتر ا ہوا تھا اور آنکھیں سو جھی ہوئی تھیں جیسے وہ پوری رات روتی رہی ہو۔ عظیم بڑے پیار سے پوچھا۔

کل! خیریت ہے نا۔ تمہارے ابو آج آفس کیوں نہیں آتے۔

کل سک پڑی اور اس کے آنسو بہہ نکلے۔ رات بارہ بجے ابو پر ہٹ اٹیک ہوا تھا۔ ان کی حالت نازک ہے۔ مجھے انہوں نے آپ کو بلانے کے لیے بھیجا ہے۔ عظیم بیتاب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اپلیکیشن لکھ کر اس نے چادر روز کی چھٹی لی۔ کل کے ساتھ وہ آفس سے نکلا اور رکشے میں دونوں کیمارڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔ میکلوڈ روڈ پر گزرتے ہوئے عظیم نے کل سے کہا۔

ڈاکٹر کو بھی نہ لے چلیں؟

بھئی بھئی آواز میں کل نے کہا۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو ڈاکٹر ابو کا علاج

کر رہا ہے۔ میں نے اسے رات بارہ بجے ہی بلوایا تھا۔ وہ صبح تک ابو کی دیکھ بھال کرتا رہا ہے اور دوائیں دیکر چلا گیا ہے۔ کہہ تو رہا تھا خطرے کی بات نہیں پر مجھے اس کی یہ تسلی جھوٹی لگتی ہے۔

غظیم خاموش رہا۔ کمل نے اس کی جیب میں رکھی تار اور خط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ یہ تار اور خط کس کا ہے — غظیم بکھ گیا۔

امی کے ہیں ؟

کمل بتیاب ہو گئی۔ خیریت ہے نا ؟

غظیم نے خط اور تار جیب سے نکال کر کمل کو تھا دیئے۔

پڑھ لو !

کمل نے خط اور تار پڑھی اس کی حالت طوفانوں میں جڑ سے اکھڑتے ہوئے پودوں جیسی افسوسناک ہو گئی تھی۔ اس نے خط اور تار اپنے پرس میں ڈال لیے اور سوچوں میں کھو گئی۔

کمل کا مکان آگیا تھا۔ غظیم نے رکشے کا کرایہ ادا کیا اور دونوں مکان میں داخل ہوئے۔ دائیں طرف والے کمرے میں فرانسس بستر پر بے سدھ پڑے تھے ان کے قریب ننھی بیل بیٹھی ان کے پاؤں دہلتے ہوئے رو رہی تھی۔ کمل آگے بڑھی اور فرانسس کا شانہ پکڑ کر نرمی سے ہلاتے ہوئے کہا۔

ابو! غظیم آتے ہیں ؟

فرانسس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر غظیم کی طرف عجیب سی بے چینی اور ویرانی سے دیکھا۔ غظیم بے کل و مضطرب ہو گیا۔ نیچے جھک کر اس نے فرانسس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔



فرانسس کی نحیف سی آواز سنائی دی۔

پہلے سے افاقہ ہے۔ پھر انہوں نے عظیم کا بازو پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔ میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں رہا۔ ویسے تو ہر شخص کو ایک روز یہاں سے رخصت ہونا ہے۔ لیکن میں جو پوری زندگی رزق کی تلاش میں بھٹکتا رہا ہوں۔ اطمینان اور سکون کے ساتھ اس دارِ فنا سے کوچ کرنا چاہتا ہوں۔ عظیم اکمل تمہاری امانت ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ اپنی زندگی میں ہی یہ امانت اس کے مالک تک پہنچا دوں۔ تم اپنی امی کو بلاؤ۔ میں ان دنوں بنی کمل کو تم سے بیاہ دینا چاہتا ہوں۔

عظیم کا سر جھک گیا تھا۔ کمل نے پرس سے ریکیانہ کا خطا اور تازہ مکال کرڈر انس کی طرف بڑھا دیتے۔

ابو! یہ ان کی امی کی تازہ اور خطا آیا ہے۔

فرانسس نے دونوں کا غزلے لیے۔ باری بادی پڑھے۔ تھوڑی دیر وہ خاموشی سے عظیم کو دیکھتے رہے جو ابھی تک ان کے سامنے سر جھکاتے بیٹھا تھا۔ پھر ان کی آواز سنائی دی۔ مدہم اور شفقت میں ڈوبی ہوئی پرسوز آواز۔

دل نہ چھوڑنا عظیم! یہی سمجھ لینا کہ تم اپنے ماں باپ کے ایک ہی بیٹے ہو۔ قیصر اگر ماں اور بہن کو نہیں رکھنا چاہتا نہ سہی۔ ہمارے پاس دو کمرے ہیں بیٹے اور یہ سب کے لیے کافی ہیں۔ تم آج ہی اپنا سامان جھونپڑی سے اٹھا کر یہاں لے آؤ۔ اور ماں بہنوں کو اسٹیشن سے سیدھا یہاں لاؤ۔ یہ ان کا اپنا گھر ہے۔ میری جب لاسوڈر انسفر

ہو گئی تو میں کوشش کر کے تمہاری تبدیلی بھی وہاں کرالونگا۔ پھر انہوں نے کل سے کہا۔  
 کل! عظیم کو دوسرے کمرے میں لیجاؤ۔ پہلے اسے کھانا کھلاؤ۔ پھر اس کے ساتھ  
 جا کر اس کا سارا سامان یہاں اٹھا لاؤ۔ کل کے چہرے پر شکر کے آنسوؤں میں نغموں  
 اور خوشیوں کا سیلاب تھا۔ اس نے بڑی بیباکی سے عظیم کا بازو پکڑ لیا۔  
 آتے میرے ساتھ! عظیم چپ چاپ اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ کل نے پہلے  
 اسے کھانا کھلایا پھر اس کے ساتھ وہ اس کا سامان لانے ریلوے کالونی چلی گئی۔







جس روز چار بجے عظیم نے ریحانہ، عطیلہ اور صائمہ کو اسٹیشن پر رسیو کرنا تھا! اسی روز عظیم کمل کے ساتھ اپنی ماں اور بہنوں کے لیے شاپنگ کر رہا تھا کہ صدر بازار میں انجارات کا ضمیمہ بچنے والے زور زور سے شور کرنے لگے۔

”حادثہ! خوفناک حادثہ! تیز رو ایک ایکپرس ٹرین سے ٹکرا گئی سینکڑوں مسافر مارے گئے۔“

عظیم پریشان ہو گیا۔ بھاگ کر اس نے ضمیمہ خریدا اور جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ کمل بھی پیلی ہو گئی تھی اور عظیم کے ساتھ وہ بھی ضمیمہ پڑھ رہی تھی۔

عظیم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ضمیمہ دہرا کرتے ہوئے اس نے دُکھتے ہجے میں کمل سے کہا۔

کمل! چلو گھر چلیں۔ خبر نہیں میری ماں بہنوں کا کیا بنا۔ میں آج ہی اپنے گھر

روانہ ہو جاؤنگا۔ اگر میری ماں بہنوں کو کچھ ہو گیا۔ تو میں زندہ نہ رہ سکونگا۔ عظیم کی آواز  
چکیا رہی تھی۔

کمل نے پیار سے عظیم کا ہاتھ تھام لیا۔

آئیے چلیں!

دونوں نے رکشہ کیا اور کیماڑی آئے۔ فرانسس کی حالت اب بہتر ہو گئی  
تھی اور وہ صحن میں ایزی چیر بر بیٹھے آرام کر رہے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے  
ہی کمل نے وہ ضمیر فرانسس کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے پڑا اور اپنے سامنے  
کھڑے عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے شفقت سے پوچھا۔

اللہ کرے تمہاری ماں اور بہن خیریت سے ہوں۔ اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔  
عظیم جیسے خواب سے چونکا ہو۔ میں ابھی گھر جا رہا ہوں۔ تیز کام کی روانگی میں  
ابھی کچھ وقت ہے میں آسانی سے اسے پکڑ لوں گا۔ فرانسس نے کمل سے کہا۔

کمل! عظیم کی تیاری کراؤ بیٹی!

کمل عظیم کو اندر لے گئی۔ جلدی جلدی اس کے پکڑے ایک ایٹھی میں جما دیتے  
اور عظیم جب ایٹھی اٹھا کر باہر نکلنے لگا تو کمل نے سو سو کے چھ نوٹ عظیم کی طرف  
بڑھاتے ہوئے کہا۔

یہ رکھ لیں آپ کے کام آئیں گے۔

عظیم انکار کر گیا۔ ان کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس پیسے ہیں۔ کمل نے نوٹ  
زبردستی عظیم کی جیب میں ڈال دیئے۔ آپ میری زندگی اور میری روح ہیں۔ اس



موقع پر آکر میں آپ کے کام نہ آؤنگی تو اور کون آئے گا۔ اس کے علاوہ میں آپ سے کچھ کہنا بھی چاہتی ہوں۔  
 غلیم گویا کہیں دُور سے بولا۔ کہو۔

جن حالات میں آپ یہاں سے جا رہے ہیں۔ میں نہیں جانتی ہم دوبارہ کب ملیں گے۔ بہر حال میں آپ کو یقین دلاتی ہوں میں آپ کو بھول نہ سکوں گی۔ آپ جاتے ہی ہمیں اپنے حالات سے آگاہ کریں۔ ورنہ میں خود لاہور پہنچ جاؤنگی۔  
 کل کا ہاتھ تھامتے ہوئے غلیم نے بھرپور چاہت سے کہا۔  
 کل! میں تمہیں بھولنا بھی چاہوں تو نہ بھول سکوں گا۔ تم میری زندگی کا سرمایہ اور سب سے قیمتی متاع ہو۔ میرے لیے تم ایک روشن شمع ہو جس کی روشنی مجھے اپنی منزل کا پتہ دیتی رہے گی۔

کل کے ساتھ اٹھی اٹھائے صحن میں آیا۔ فرانسس سے ملا پھر وہ لمبے لمبے اور تیز ڈگ بھرتا ہوں گھر سے نکل گیا۔

دوسرے روز جب وہ اپنے گھر داخل ہوا تو اس نے دیکھا صحن میں دو نرزدیک کے رشتہ کی بیشمار عورتیں بھیانک اور سنان راتوں جیسے بین کرتی ہوئی رو رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھا صحن میں تین پلنگ رکھے تھے۔ جن کے گرد عورتیں بیٹھی رو رہی تھیں۔ اس کے یہ بھی دیکھا آئیہ جواب اس سے بے پناہ محبت کرنے لگی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے اور دیوانہ وار وہ اپنا سر پیٹ پیٹ کر رو رہی تھی۔ غلیم کو دیکھتے ہی آئیہ ٹمٹکی بازو کما سے دیکھنے لگی۔ ایک طرف عاصفہ اور اس کی ماں بیٹھی رو رہی تھیں۔ غلیم آگے بڑھا

اور ان تینوں پلنگوں کے اُپر سے جب اس نے چادریں ہٹائیں تو اس نے دیکھا وہاں  
ریحانہ، عطیہ اور صائمہ کی لاشیں پڑی تھیں۔ عظیم نے زخمی ہجے اور دل نگار آواز میں  
اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے خود سے پوچھا۔

تو کی میری ماں اور بہنیں مر گئیں ؟

قبل اس کے کوئی اس سے بات کرتا۔ کوئی اسے مخاطب کر کے اس کی ڈھارس  
بندھاتا ایک طرف سے سعادت تیز تیز قدم اٹھاتے آئے اور عظیم کو پٹالیا۔ عظیم کے  
ہاتھ سے اٹھی چھوٹ کر زمین پر گر گیا اور وہ سعادت سے پیٹ کر بچوں کی طرح ہلک  
ہلک کر رونے لگا۔ آسہ چھینیں مار کر روتی ہوئی اُٹھی اور عظیم کا اچھی اٹھا کر اندر رکھ آئی۔  
دروازوں چپا بھتیجا گلے مل کر رو رہے تھے اور عاصفہ انہیں ٹمٹکی بانڈھے دیکھ رہی  
تھی۔ وہ عظیم کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جن میں دُور دور تک ہمدردی،  
اپنائیت اور کچھ کچھ پر خلوص محبت کی جھلک تھی۔ اس نے عظیم کے ساتھ اس لیے شادی  
سے انکار کر دیا تھا کہ وہ شادی کے بعد ریحانہ کی بات مانے گا اور اس کی کوئی حیثیت نہ ہوگی  
اب جبکہ ریحانہ مر چکی تھی عظیم کی طرف بڑھنے کے لیے اس کے راستے میں کوئی دیوار، کوئی  
رکاوٹ اور مستقبل میں اٹھنے والا کوئی طوفان نہ تھا۔ اب وہ عظیم کی طرف بڑھنے کیلئے  
ان پرندوں کی طرح آزاد تھی جو اطمینانیت کے ساتھ نیلی فضاؤں میں زندگی کی خوشیوں  
سے بھرپور غوطے لگاتے ہیں۔ شاید ————— شاید عاصفہ کے دل میں کہنے  
محبتوں کی یادیں اُٹھ کھڑی ہوتی تھیں اور ————— اور جب ایسی یادوں کے  
طوفان اُٹھتے ہیں تو ان کے آگے بندھوڑا ہی بانڈھا جاسکتا ہے۔ وہ انسانی شخصیت



کے ہر پہلو کو بہا کر لیجاتے ہیں۔ سعادت سے علیحدہ ہو کر عظیم اپنی ماں کے پلنگ سے لپٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ اس کے ایک طرف قیصر بھی بیٹھ کر آنسو بہا رہا تھا۔ شام سے ذرا پہلے جنازے کی تیاری شروع ہوتی۔ شاید عظیم کا ہی انتظار کیا جا رہا تھا۔ عظیم نے ہر کام میں کسی خود کار مشین کی طرح حصہ لیا۔ ابھی تک اس نے کسی سے بات نہ کی تھی۔ آسیہ نے کئی بار اسے مخاطب کیا۔ پر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ سعادت نے بار بار اسے جھنجھوڑا مگر عظیم پھر بھی نہ بولا۔

تینوں ماں بہنوں کو اپنے ہاتھوں سے مٹی تلے دفن کرنے کے بعد عظیم جب گھر لوٹا تو سعادت اسے اپنے ہاں لے گئے۔ سعادت اور آسیہ نے اپنی اپنی بھرپور کوشش کی کہ عظیم کسی سے بات کرے پر وہ کامیاب نہ ہوتے۔ سعادت اٹھ کر جب اسے کوئی انجکشن دینے لگے تو اسی وقت اچانک باہر برآمدے میں قیصر گزرا۔ وہ باہر سے آتے ہوئے مہمانوں کو کھانا کھلانے کی بھاگ دوڑ کر رہا تھا اسے دیکھتے ہی عظیم کسی زخمی درندے کی طرح دھاڑا۔

ٹھہر قیصر!

قیصر ٹھٹھک کر وہیں رک گیا۔ عظیم طوفان کی طرح اٹھ کر باہر آیا۔ سعادت اور آسیہ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھکے قیصر کے پاس آ کر عظیم نے زہریلے لہجے میں کہا۔

تم — تم میری ماں اور بہنوں کے قاتل ہو — ذیل انسان تم تین بناتِ آدم کی موت کے ذمہ دار ہو۔ نہ تنگ کر کے تم انہیں گھر سے نکالتے اور نہ وہ اس حادثے کا شکار ہوتیں۔ عظیم آگے بڑھا اور قیصر کا گریبان پکڑ لیا۔

ذلیل کیلئے! بے شرم بے حیا! میں تمہیں زندہ نہ چھوڑ دوں گا۔ غلیم نے اپنا دایاں  
 فولادی ہاتھ اٹا کر کے قیصر کے مُنہ پر دسے مارا۔ قیصر بڑھکھڑا کر رہ گیا۔ سب لوگ بھاگتے  
 ہوتے وہاں آ جمع ہوتے تھے۔ ان میں عاصفہ تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر قیصر کی حمایت  
 نہ کی۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی۔ حالانکہ وہ اس کا شوہر تھا۔

عاصفہ کو دیکھتے ہی غلیم نے دو بھر پور طمانچے اس کے مُنہ پر مارتے ہوئے کہا۔  
 سب سے بڑی ڈانٹ تم ہی — تم ہی وہ ہو جس نے اس گھر میں خاک اڑادی ہے۔  
 قیصر بھی اب آپے سے باہر ہو گیا تھا اور آگے بڑھ کر اندھا دھند غلیم پر مکے برسانے  
 لگا تھا لیکن غلیم کے سامنے اس کی حیثیت یوں تھی گویا بھڑیلے کے آگے کمزور دل  
 لومڑی۔ غلیم نے آٹا فانا قیصر کو نیچے گرا لیا۔ پھر اس کی چھاتی پر سوار ہو کر وہ بڑی طرح اسے  
 مارنے لگا۔ سعادت اور آسیہ نے اسے پکڑ کر قیصر کے اوپر سے اتارنے کی کوشش  
 کی لیکن ناکام رہے۔ غلیم زور زور سے چلا رہا تھا۔

چھوڑ دو مجھے! میں اسے زندہ نہ چھوڑ دوں گا۔ یہ قاتل ہے اپنی ماں اور بہنوں کا  
 سعادت آسیہ اور کچھ دوسرے لوگوں نے مل کر غلیم کو زبردستی کھینچ کر علیحدہ  
 کیا۔ پر وہ ان کی گرفت سے نکل کر پھر قیصر پر سوار ہو گیا تھا۔ اس بار اس کے دونوں  
 ہاتھ قیصر کی گردن پر پڑے تھے۔

قیصر! تمہیں اب جینے کا کوئی حق نہیں۔

سب لوگوں نے مل کر ایک بار پھر غلیم کو علیحدہ کیا۔ وہ زور زور سے چلا رہا  
 تھا اور جو لوگ اسے پکڑے ہوئے تھے انہیں مار رہا تھا۔



چھوڑ دو مجھے! تم سب قاتل ہو۔ میں کسی کو نہ چھوڑ دوں گا۔ تم لوگوں میں کوئی بھی انسان نہیں۔ میں سب کا خون کر دوں گا۔ ہا ہا ہا ہا۔ وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ پاگل ہو گیا تھا۔ بچارہ۔

سب لوگوں نے بڑے جتن اور کوشش کے بعد اسے صحن کے اندر ایک درخت کے ساتھ رسیوں میں جکڑ دیا تھا۔ آسیہ اس کی حالت پر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ سعادت نے اسے انجکشن دے کر بے ہوش کر دیا۔ پھر ایک کمرے میں بستر پر ڈال دیا گیا اور وہ کمرہ باہر سے لاک کر دیا گیا۔

دوسرے روز کسی کی ہمت نہ پڑ رہی تھی کہ وہ کمرہ کھول کر عظیم کے پاس جاتے کوئی بھی اس کیلئے ناشتہ لیجانے کو تیار نہ تھا۔ آخر سعادت خود تیار ہوتے انہوں نے ناشتے کے ساتھ ایک انجکشن اور عظیم کو کھلانے کے لیے کچھ ٹیبلس لیں اور اس کمرے کی طرف بڑھے۔ آسیہ جو ان کے قریب سوچوں میں کھڑی تھی۔ بھاگ کر آگے بڑھی اور سعادت سے ناشتے کی ٹرے لیتے ہوئے اس نے کہا۔

الو! میں خود انہیں ناشتہ کراؤں گی۔ مجھے اُمید ہے۔ وہ مجھے نہیں ماریں گے وہ بیشک اپنے حواس میں نہیں اس کے باوجود میرا دل کہتا ہے۔ وہ ضرور میرا خیال رکھیں گے۔ کچھ لوگ احتیاطاً اس کمرے کے باہر کھڑے ہو گئے۔ سعادت اور آسیہ اندر داخل ہوئے۔ عظیم اپنے بستر پر سویا ہوا تھا۔

آسیہ نے بڑی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھ کر عظیم کو جگایا۔ عظیم دونوں باپ بیٹی کو یوں گھوڑنے لگا تھا جیسے وہ دونوں اس کے لیے اجنبی ہوں۔

آسیہ نے اس کے ان تیرہ روں کی پرواہ نہ کی پہلے اس کے ہاتھ اور منہ دھلایا پھر اپنے ہاتھ سے لقمے بنا کر اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔ عظیم نے واقعی اسے کچھ نہ کہا تھا اور اس کے ہاتھ سے ناشتہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد سعادت نے اسے انجکشن دیکریٹیلٹس کھلائی دو دنوں باپ بیٹی قدرے مطمئن انداز میں کمرے سے نکلے اور دروازہ پہلے کی طرح باہر سے لاک کر دیا گیا۔

عظیم بچا رہ پاگل ہو گیا تھا۔ اور سعادت دن رات محنت کر کے اس کا علاج کرنے لگے تھے۔ آسیہ یوں اس کی خدمت کر رہی تھی گویا وہ اس کی منگیتر اور منسوبہ نہیں اس کی بیوی ہو۔





پاگوں کی حالت میں اس کمرے کے اندر بند عظیم کو کئی ہفتے گزر گئے تھے سعادت خود اس کا علاج کر رہے تھے اور اب کافی حد تک وہ اپنا ذہنی توازن بحال کر چکا تھا۔ ایک روز صبح ہی صبح مکمل سیاہ رنگ کا ایک اٹچی اٹھائے عظیم کے گھر داخل ہوئی۔ قیصر اور عاصفہ دونوں اپنے اپنے کام پر جا چکے تھے۔ لہذا مکان کے سارے کمروں کو مالا لگا ہوا تھا۔ کیونکہ اب اس مکان میں قیصر اور عاصفہ ہی رہ رہے تھے۔ عظیم بچارہ سعادت کے ہاں ایک کمرے میں بند تھا۔ قیصر کبھی اسے ملنے نہ گیا تھا۔ پر عاصفہ اس سے پوری چوٹی کھر کی میں سے عظیم کو ضرور دیکھا کرتی تھی۔

مکمل پریشانی میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے سعادت کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ وہ عظیم کے مکان کی طرف آئے اور مکمل کو پکارا۔  
کس سے ملنا چاہتی ہو بیٹی!



کل نے لڑتی اور ہچکچاتی آواز میں کہا۔

مجھے غلیم سے ملنا ہے۔

کہاں سے آئی ہو؟

یہیں لاہور سے

غلیم کو کیسے جانتی ہو۔

ہم پہلے کراچی تھے۔ میرے ابو بینک میں ہیں اب ان کی یہاں ٹرانسفر ہو گئی بلکہ غلیم بھی وہاں اسی بینک میں تھے اور ہمارے گھر ہی رہتے تھے۔

تمہارا نام کیا ہے بیٹی!

میرا نام کل ہے۔

کیا تم جانتی ہو غلیم پر کیا گزری۔

محموک ننگے ہوتے کل نے مغموم آواز میں کہا۔

میں وہی تو پوچھنے آئی ہوں؟

تو سنو میری بیٹی! اثرین کے حادثے میں اس کی ماں اور دونوں بہنیں مر چکی

ہیں۔ وہ خود پاگل ہو چکا ہے۔ اور میرے مکان کے ایک کمرے میں بند ہے۔

میں اس کا انکل ہوں۔ میرا نام سعادت ہے۔ میں ————— سعادت ایک

دم خاموش ہو گئے۔ کل کے ہاتھ سے اپنی چھوٹ کر زمین پر گرا۔ پھر وہ بُری طرح

چکراتی اور بے سدھ سی ہو کر زمین پر گر گئی۔ سعادت نے زور سے پکارا۔

آسیہ! آسیہ!



آسیہ اپنے کمرے سے بھاگتی ہوئی نکلی۔ کیا ہوا ابو جی !  
اس لڑکی کو سہارا دے کر اٹھاؤ بیٹی۔ خود وہ آگے بڑھے اور اچھی اٹھالیا آسیہ  
نے کمر کو اٹھا کر اپنی گود میں لیتے ہوئے پوچھا۔

یہ کون ہے ابو جی !

اس نے اپنا نام کمر بتایا تھا بیٹی۔ یہ عظیم سے ملنے آئی ہے۔ کہہ رہی تھی۔ کمر اچھی  
میں عظیم ان کے ہاں رہتا تھا۔ میں جب اسے بتایا کہ عظیم کی ماں اور بہنیں مر گئی ہیں اور  
خود وہ پاگل ہو چکا ہے تو یہ غش کھا کر گر گئی۔ ٹھہرو میں اسے ہوش میں لانے کی  
تدبیر کرتا ہوں۔

سعادت اچھی کو روڈ درمیان رکھ کر پانی کا گلاس بھر لائے اور کمر کے منہ پر  
پھینٹ دیتے۔ کمر نے آنکھیں کھول دیں اور بتیاب ہو کر سعادت سے پوچھا۔  
کیا آپ مجھے عظیم سے ملا دیں گے۔

بیٹی! اس کا ذہن ابھی پوری طرح بحال نہیں ہوا۔ جو بھی اسے ملنے کی کوشش  
کرتا ہے وہ اسے مارتا ہے۔

کمر آسیہ کی گود سے نکل کر کھڑی ہو گئی۔ اگر وہ مجھے جان سے بھی مارتا تو  
میں سمجھونگی مجھے میری منزل مل گئی ہے۔

سعادت اپنے مکان کی طرف بڑھے۔ آؤ میرے ساتھ — کمر ان کے پیچھے  
پیچھے چلنے لگی اور اس کے ساتھ ساتھ آسیہ تھی — سعادت نے ایک کمرے کی  
کھڑکی کھولی جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کمر نے دیکھا اندر ننگے فرش

پر عظیم سر جھکائے بیٹھا تھا۔ کل نے سعادت سے کہا۔

کیا آپ اس کمرے کا دروازہ نہ کھولیں گے۔ میں اندر جا کر ان سے ملا پاتی ہوں۔ اگر اس نے تم پر ہاتھ اٹھایا تب — آپ بے فکر رہیں مجھے اُمید ہے وہ مجھے پہچان لیں گے۔

سعادت نے دروازہ کھولا۔ اور کل بلا جھجک اندر داخل ہو گئی۔ سعادت اور آسیہ بھی احتیاطاً کمرے کے اندر کھڑے ہو گئے تھے۔ عظیم کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کل نے اپنی دھیلی آواز میں کہا۔

عظیم! عظیم!

عظیم نے سرگھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں کیسی ویران اور ملال بھری تھیں۔ اس کے چہرے پر شام کے تاریک ماتی سایوں جیسی اداسی تھی۔ کل نے دیکھا ذہنی مفلسی کا شکار ہو کر عظیم کا چہرہ کیسا مٹیالا اور سوکھا سا ہو گیا تھا۔ عظیم جب پھٹی پھٹی نگاہوں سے کل کو گھورتا رہا تو کل دھڑکی اور ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

عظیم! مجھے پہچانو۔ میں کل ہوں۔

عظیم کھڑا ہو گیا اور کل کے دونوں ہاتھ محام لے۔

تم کب یہاں آتی ہو؟

اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کل نے کہا۔ ابو کی ٹرانسفر یہاں ہو گئی ہے اور ہمیں

یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔

تمہارے ابو کیسے ہیں۔



اکثر بیمار رہتے ہیں۔ آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ وہ ضرور میرے ساتھ آتے۔  
لیکن ان دنوں وہ پھر دل کے شدید اٹیک میں مبتلا ہیں۔

اچانک عظیم کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس پر وحشت، بربریت چھانے لگی۔ پھر  
اس کی مٹھیاں پھینچنے لگیں جیسے اس کا جسم بری طرح اینٹھ رہا ہو۔ سعادت نے کھل  
کو پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

باہر نکل آد بیٹی! تمہارے باپ کی بیماری کا سن کر عظیم کی حالت بگڑ رہی ہے۔  
اور اس کی یہ حالت خطرناک ہے۔ کھل نے سعادت سے اپنا آپ چھڑا لیا اور بھاگ کر  
عظیم کی پشت سے پٹ کر پھوٹ پھوٹ کر دوتے ہوئے اس نے کہا مجھے آپ کی  
امی اور بہنوں کے مرنے کا دکھ ہے۔ میں آپ کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی جس  
حالت میں آپ اس کمرے کے اندر بند ہیں۔

عظیم اب بالکل نامدل دکھائی دینے لگا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے  
موٹے موٹے آنسو۔ ساون بھادوں کی موسلا دھار بارش کی شفاف بوندھوں کی  
طرح —

کچھ دیر تک وہ دونوں سیڑج کمرے آنسو بہاتے رہے پھر کھل عظیم کے سامنے  
آئی اور اپنی ساڑھی کے پلو سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔  
میں آپ کا دوسرا بیٹی لائی ہوں۔ اس میں آپ کے سارے کپڑے بھی ہیں پھر  
اس نے عظیم کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔  
آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟

عظیم نے نفی میں سر ہلا دیا۔

کمل اپنا منہ عظیم کے کان پر لیگتی اور سرگوشی کی۔

آپ کو دوپلوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لیں۔

عظیم کے ہونٹوں پر حنیف سی مسکراہٹ بکھر گئی اور دھیمی آواز میں اس نے کہا۔

نہیں۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ کمل پیچھے ہٹتی ہوئی یولی۔ میں اب ہر روز آپ سے ملتی رہونگی۔

کمل، سعادت اور آسیہ سے کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی اور دروازہ انہوں نے پہلے کی طرح لاک کر دیا۔ کمل نے سعادت سے کہا۔

مجھے اب اجازت دیجئے؟ آسیہ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ

لیا۔ تھوڑی دیر بیٹھو چائے پی کر جانا۔ کمل نے غور سے آسیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ آپ عظیم کی کیا لگتی ہیں۔

آسیہ کے بجائے سعادت بولے۔

یہ میری بیٹی ہے۔ اس کا نام آسیہ ہے اور یہ عظیم کی منگیتر بھی ہے۔ کمل

کانپ گئی۔ اس کا رنگ پھولی ہوئی سرسوں جیسا ہو گیا تھا۔ اس کی حالت یوں

تھی گویا اچانک اس پر کسی نے کھوتا ہوا پانی انڈھیل دیا ہو۔ اس کے چہرے پر

کئی رنگ اُڑ رہے تھے جیسے تیز طوفانوں میں کشتی کے بادبان پھڑپھڑا گئے ہوں۔

آسیہ نے اسے چونکا دیا۔

آئیے میرے ساتھ؟



کل نے اپنا ہاتھ پھڑاتے ہوئے کہا۔ میں پھر کبھی آپ کے پاس بیٹھوں گی۔  
 اس وقت مجھے جلدی ہے۔ میرے ابو سخت علیل ہیں اور میرے سوا کوئی اُن کی  
 دیکھ بھال کرنے والا نہیں۔ کل واپس مڑی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکل گئی۔  
 عظیم سے ایک بار ملنے کے بعد کل ایسی غائب ہوئی کہ دوبارہ اسے ملنے  
 ہی نہ آئی۔ شاید یہ سن کر کہ آسہ عظیم کی منسوبہ ہے۔ اس کی نسوانیت کے وقار کو  
 دھچکا لگا تھا۔ اس کی ذہنی رفعت اس انکشاف سے زمین کی سر و پا مال میں اتر گئی  
 تھی۔ بڑے ست بھاؤ کے ساتھ عظیم سے ملنے والی مکمل سرمدی وجود کا پرتیراز  
 بن گئی تھی۔ اس کی زندگی کے گیتوں کی بازگشت جو اس سے چھین لی گئی تھی۔  
 چند ہفتے اور سعادت کے زیر علاج رہنے کے بعد عظیم ذہنی طور پر تندرست  
 ہو گیا تھا لیکن عظیم وہ پہلے جیسا عظیم نہ رہا تھا اس نے اپنے آپ کو تہناتی اور  
 خود فراموشی میں ملغوف کر لیا تھا۔ اسے کل کی تلاش تھی لیکن وہ تو اپنا پتہ بتائے  
 بغیر لوں غائب ہو گئی تھی جیسے کبھی ملاقات ہی نہ ہوئی ہو۔ اسے ذہنی سکون اور  
 آسودگی چاہیے تھی جو اسے میسر نہ تھی۔ دیکھنا بچا رہی زندہ ہوتی تو شاید اسے سنبھال  
 لیتی۔ لیکن وہ تو ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی تھی۔ آسہ لاکھ اُس کی دلجوئی کرتی۔ پروہ  
 بات کہاں۔ عظیم کو آسہ سے کوئی رغبت کوئی دلچسپی نہ تھی پروہ معصوم لڑکی اپنے  
 جسم کے ہر تار سے قربان ہو رہی تھی۔ قیصر نے عظیم سے ملنا ترک کر دیا تھا۔ ہاں  
 عاصفہ کا دل ضرور چاہتا تھا کہ وہ اس عظیم کا قرب حاصل کرے جو اب ماں کی  
 گرفت سے آزاد تھا۔ لیکن وہ اس خوف کے باعث عظیم کے قریب نہ آتی تھی کہ

عظیم مارے گا۔

یوں عظیم اکیلا ہی اکیلا اندر ہی اندر سلگتا اور پھکتا رہا کوئی اس کے دل کا تپش، درد و الم، ذہن کا تحیر۔ اس کے باطن کا شور و مژدہ اس کی آنکھوں کی حسرت، روح کی کلینا اور اس کی بے بسی اور شکستگی نہ جان سکا۔ اسیہ گوچو بیس گھنٹے اس کے ساتھ بندھی رہتی تھی لیکن اس کی کرب آتش مار و روح کا سکون نہ بن سکی اور اس کے ذہن میں حسرت دیاں کا اندھیرا اپنے پورے ذہریلے پن کے ساتھ پھیلتا رہا اور اس کے اسی ذہنی اور نفسیانی دباؤ نے اسے خدا کا منکر بنا دیا۔ خدا پر اس کا اعتقاد یکسر جاتا رہا تھا اور وہ سرعام لوگوں کے ساتھ خدا کے خلاف بولنے لگا۔ اس خدا کے خلاف جس نے زمین و آسمان کی بساط کچا کر انسان کو اس کا امین بنا دیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بیسویں صدی کا انسان جو فرزند ازل وابد ہے گزری ہوئی انسانی نسلوں کی خاک اڑاتا ہوا بڑی تیزی سے جہنم کے کشیف و حند لکوں کی طرف بھاگ رہا ہے۔





وہ رات، سرد، ویران اور تاریک تھی۔ پچھلے پہر کا زرد چاند غروب ہو چکا تھا۔  
 ننھے ننھے ستارے آسمان پر جزیروں کی طرح تیر رہے تھے۔ ستاروں کی قرمزی اور  
 کمزوری، لہری سنسان اور ڈولیدہ فضاؤں میں کھوہ گئی تھیں۔ سعادت کے  
 ہاں ایک ہی کمرے میں عظیم، آسیہ اور سعادت سوئے ہوئے تھے۔  
 عظیم نے کروٹ بدلی پھر سر اٹھا کر سعادت اور آسیہ کی طرف دیکھا دونوں  
 گہری نیند سوئے ہوئے تھے وہ بڑی آہستگی سے اٹھا چل پہنی اور بے آواز  
 چال کے ساتھ وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ لان میں آکر اُس نے ادھر ادھر دیکھا  
 پھر باہر نکل گیا۔ اور ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والی سڑک پر چل نکلا۔ رات  
 کے مناتے میں سرد اور تیز ہوائیں نیچر کے مغموم گیت گارہی تھیں جیسے  
 جیسے کھوکھلے سرکنڈے کی بانسری کے زخمی سینے سے سرست آہوں کی آوازیں

انجر ڈوب رہی ہوں۔ وہ چلتا رہا کہیں رکے اور قیام کیسے بغیر۔

وہ سیدھا ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے آیا اور لکڑی کے اس بیچ پر بیٹھ گیا، جہاں پہلے سے ایک بوڑھا اور لاغر مرد بیٹھا اونگھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ شاید مسافر تھا۔

عظیم جب بیچ پر بیٹھ گیا تو اس بوڑھے نے سرگھا کر چند لمحوں تک غور سے اسے دیکھا پھر سوالیہ انداز میں پوچھا۔

کہاں جاؤ گے میاں!

عظیم نے بے اعتنائی سے کہہ دیا — کہیں نہیں۔

کہاں رہتے ہو؟

یہیں لاہور میں۔

پھر گھر سے کیوں نکلے ہو۔

سلگتی ہوئی آواز میں عظیم نے کہہ دیا۔ خدا کو تلاش کرنے۔

بوڑھا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کیا تمہیں یقین ہے تم خدا کو تلاش کر لو گے۔ عظیم نے

اس سے سوال کر دیا۔

تمہارے خیال میں مجھے خدا کو کہاں تلاش کرنا چاہیے۔

اگر خدا کو ڈھونڈنا ہی ہے تو وہ تمہیں مسافر خانے کی اس لکڑی کی بیچ پر نہ

ملے گا۔ جاؤ اسے مکبتوں، مدرسوں، مسجدوں اور معبدوں میں تلاش کرو۔ عظیم نے ایک زہریلا تہقہہ لگایا۔



مکتبوں اور مدرسوں میں؟ جہاں تعلیم تجارت اور عمارتیں یا ست دانوں کی تائیک آماجگاہیں بن گئی ہیں۔ مسجدوں اور معبدوں میں؟ جہاں صحت وہ لوگ جاتے ہیں جو بے آسرا و بے مایہ ہیں اور خدا پر اندھا اور اٹل یقین رکھ کر اسے اپنا مددگار و محافظ جان کر اس کی خوشنودی حاصل کرنے جاتے ہیں۔

بوڑھے نے کوئی جواب نہ دیا۔ عظیم وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شہر کی مسجدوں میں صبح کی اذانیں ہونے لگیں تھیں۔ سردی تیز ہو گئی تھی۔ وہ ایک تھوڑے کلاس اور ایک دم کنڈم ہوٹل میں داخل ہوا اور چائے پینے کے ساتھ ساتھ دہکتی ہوئی کوئلوں کی انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر اپنے آپ کو گرم بھی کرنے لگا۔

دوسرے روز سہ پہر تک وہ یوں ہی شہر میں بے مقصد گھومتا رہا۔ ایک مسجد کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رکا۔ سر جھکا کر کچھ سوچا۔ پھر مسجد میں داخل ہوا۔ اندر کوئی بارش بزرگ عبادت کر رہے تھے۔ شاید مسجد کے امام ہونگے۔ عظیم ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ جب وہ عبادت سے فارغ ہوئے تو عظیم نے ان سے پوچھا۔

مجھے خدا کی تلاش ہے۔ کیا آپ میری کوئی مدد کر سکتے ہیں؟  
اس بزرگ نے ایک بار گہری مگر غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھا پھر کسی قدر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

خدا تو ہر جگہ موجود ہے۔ آسمانوں میں۔ زمین کی سطح سے پاتاں تک، نیلی فضاؤں میں وہ تو ہر جگہ موجود ہے۔ یہ سمندروں کی غزاتی ہوتی لہریں، نیلی فضاؤں میں تیرتے

ہوئے طہور، یہ اشجار و نجوم، بادل اور برق کی روشنی — یہ پہاڑوں سے نکلنے والے اور میدانوں میں بہہ کر سمندر میں گرنے والے پانی کے دھارے سب اس کے وجود کی نشانیاں ہیں پر اس کے لیے جو عقل و شعور رکھتا ہو۔

عظیم نے پھر پوچھا۔ کیا اسے اپنے سرمدی راز رکھنے والے وجود سے باہر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

وہ بزرگ تلملا گئے۔

تم انہونی باتیں کرتے ہو۔ اگر تمہیں خدا کی تلاش ہے تو جاؤ پہلے اپنے آپ کو اس قابل بناؤ کہ وہ تم پر اپنے سارے سرستہ راز عیاں کر دے۔

کیا آپ مجھے کسی ایسے شخص کے متعلق بتا سکتے ہیں جو اپنے لیے ان سرستہ رازوں کو عیاں کر چکا ہو۔

انہوں نے پھر غفگی میں کہا۔ تم گمراہ بھٹکے اور حالات کے تائے ہوئے دکھائی دیتے ہو۔ جاؤ خدا سے گڑ گڑا کر دعا مانگو۔ وہ یقیناً تمہاری راہنمائی کرے گا۔

وہاں سے نکل کر عظیم ایک کلیسا میں داخل ہوا۔ اندر ایک پادری سفید کپڑے پہنے اور گلے میں سنہری صلیب لٹکائے گرجے کی صفائی کر رہا تھا۔

عظیم کو دیکھتے ہی پادری نے پوچھا۔

تم کون ہو اور کس لیے آتے ہو؟

عظیم نے کوئی جواب نہ دیا اور آگے بڑھ کر مقدس مریم کے بت کو دیکھنے لگا۔ پادری نے پھر پوچھا۔





کس لیے گرجے میں آتے ہو؟

غلیم نے تیز نگاہوں سے اسے دیکھا۔ خدا کو ڈھونڈھنے۔ پادری شش و پنج میں پڑ گیا۔ غلیم آگے بڑھ کر عیسیٰ علیہ السلام کے اس بُت کو دیکھنے لگا جو آنوس کی جگہ پر صلیب پر لٹک رہا تھا۔ پادری کی طرف دیکھتے ہوئے غلیم نے پوچھا۔

تم کب تک اپنے پیغمبر کو صلیب پر لٹکائے رکھو گے؟

پادری نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ جب تک یہ دوبارہ انسانیت کی بھائی کے لیے نزول نہیں کرتے۔

غلیم نے کچھ سوچا پھر باہر نکل گیا۔ اس کا رخ گوالمندھی کی طرف تھا وہ چلتا رہا۔ سورج اب غروب ہو چکا تھا۔ لمبی کالی سیام اور سرد رات اپنے پنکھ بھیل چکی تھی وہ شاید گھر واپس نہ جانا چاہتا تھا۔ اس لیے کسی ٹھکانے کی تلاش میں تھا۔ جہاں وہ رات بسر کر سکے مغلیہ دور کی ایک پرانی پونا عمارت کے سامنے دھڑک گیا جس کے وسط میں چھوٹا سا ایک مندر تھا۔ شاید وہ عمارت کبھی دھرم سالہ رہی ہوگی۔ دو منزلہ عمارت تھی اور نیچے اوپر چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔

وہ عمارت کے اس گیٹ سے جو کسی بیوہ کی مانگ کی طرح کھلا اداس اور بغیر دروازے کے تھا اندر داخل ہو گیا۔ کمروں کے اندر بجلی کے بلبوں کی روشنی چھن چھن کر نکل رہی تھی۔ وہ عمارت کے وسیع آئینے میں مندر کے سامنے آکھڑا ہوا اور حالات کا جائزہ لینے لگا۔ مندر کے سامنے ہاتھ سے کھینچی جانے والی ایک رہی کھڑی تھی۔ ذرا دائیں طرف اطماس کا درخت یوں کھڑا تھا جیسے برسوں سے وہ یہاں کے مکینوں

کی بے بسی اور لاچارگی دیکھ دیکھ کر تھک گیا ہو۔

وہ مندر کی طرف آگے بڑھنے لگا تھا کہ رُک گیا۔ عمارت میں ایک لاغراورد بلا پتلا کتا داخل ہوا وہ اپنے منہ میں دو خشک روٹیاں اٹھائے ہوئے تھا۔ املتاس کے خاکسری تنے کے پاس آکر کتے نے روٹیاں رکھ دیں۔ چند لمحوں تک غور سے عظیم کو دیکھتا رہا۔ پھر دو چار بار بھونکا اور یوں مطمئن ہو کر کہ اسے کوئی خطرہ نہیں وہ املتاس کے خاکسری تنے کے پاس گر پڑا کھود کر دو دونوں خشک روٹیاں زمین میں دبائے لگا۔ شاید وہ کہیں سے پیٹ بھرا ہوا تھا۔ اور وہ دو روٹیاں اپنے آٹھے وقت کے لیے محفوظ کر رہا تھا۔

عظیم کتے کی حرکات کو غور سے دیکھتا رہا۔ ایک دم وہ چونک پڑا۔ رات کے گہری سناٹے میں مندر کے اندر سے گانے بجانے کی آوازیں سنائی دی تھیں وہ آگے بڑھا اور چاند کی روشنی میں دیکھا مندر دو چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرہ تو ایک تھا زندان کی کسی سیلی کو ٹھہری کی طرح۔ دوسرے کمرے سے روشنی پھوٹ رہی تھی اس نے کھڑکی کے نیم داپٹ سے اندر دیکھا۔

ایک بوڑھا آدمی جو شکل و صورت سے ہندو لگتا تھا۔ دیوار کے ساتھ بیٹھا ہر نیم بجاتے ہوئے گارہا تھا۔ اس کے سامنے دائیں طرف ایک معصوم سا لڑکا بیٹھا ڈھولک بجا رہا تھا اس کی عمر بارہ برس کے قریب ہوگی۔ بائیں طرف تیرہ چودہ برس کی تیکھے نقوش والی ایک حسین لڑکی بیٹھی تھی اس کا سر جھکا ہوا تھا جیسے وہ اس بوڑھے کا گانا سننے میں محو ہو۔ لڑکی اور لڑکے کی شکل آپس میں ملتی تھی۔ شاید بہن بھائی



ہوں گے۔

عظیم وہاں کھڑا ہو کر انہیں سننے لگا۔ بوڑھا گارہا تھا۔

میرے ہمدردو! میرے رفیقو!

قبل اس کے مسجدوں میں اذان ہو اور کوزہ گراپنے چاک کو حرکت دیں۔ قبل اس کے کہ طویل شب کی بیداری کے بعد راہب اٹھیں اور عبادت کی گھنٹیاں بجائیں۔

میرے ساتھیو! میرے چاہہ گرو!

اس سے پہلے کہ مجھ پر اپنی کشتیوں کے بادبان کھول دیں۔ اس سے پہلے کہ سورج کی تپتی شعاعیں عدم کی آتشی خوشبو لیکر چاروں طرف بکھر جائیں۔ اس سے پہلے کہ فطرت کے ہاتھ تخلیق اور فنا کے لیے اٹھیں۔ اور اس فانی جہاں میں خوشی اور ماتم کے گیت سنائی دیں۔ اٹھو ہم محنت کر کے اپنے لیے امن و سکون کے جزیروں کی تلاش کریں۔ ورنہ غربت کے شعلے اپنی آگ اگلتی زبانیں نکالے۔ ہماری طرف بڑھ کر ہمیں خاکستر کر دیں گے۔

میرے دوستو! میرے رفیقو!

بلند و بالا خیالات کی شکنیں توڑ کر ہم اپنے لیے سوکھی روٹی اور باسی بنری کا سامان کریں۔ میرے فرزندو! آؤ مل کر دنیا کی ابتدا اور آغاز کے گیت گائیں اور ظلمت میں اپنے لیے نور کی تلاش کریں۔ اگر ہم اکناف عالم میں پھیل کر اپنے لیے محنت و کشمکش کریں تو تار یک رات ایک ماں کی طرح ہمارا ساتھ دیگی۔

اُو۔ اُو دوستو! محنت کشی اور علم ہی کے ساتھ آپس میں روحی مفاہمت کر کے ہم انسانیت کو گرسنگی کے گردھوں اور قنوطیت کے نشیب سے نکالیں۔

اچانک وہ بوڑھا گاتے گاتے خاموش ہو گیا۔ اس نے کھڑکی میں کھڑے غلیم کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے ہاتھ ہارمونیم پر رک گئے تھے اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈھولک بجانے والے لڑکے کے ہاتھ بھی ساکن ہو کر رہ گئے۔ لڑکی نے چونک کر سر اُپر اٹھایا اور سوالیہ لگا ہوں سے کبھی بوڑھے اور کبھی اپنے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

غلیم وہاں سے ہٹ کر اُلتاس کے تنے کے پاس آ بیٹھا۔ اس کے قریب ہی وہ کتابیٹھا تھا جس نے وہاں روٹیاں دہاتی تھیں۔ غلیم سخت سردی اور بھوک محسوس کر رہا تھا۔ اس نے زمین کھود کر وہ دونوں روٹیاں نکال لیں جو کتے نے دفن کی تھیں۔ مندر کے اندر گانے والا بوڑھا، لڑکا اور لڑکی تینوں باہر کر اس رہڑی کے پاس کھڑے ہو گئے تھے جو مندر کے سامنے کھڑی تھی اور بڑے غور سے غلیم کو زمین کھودتے ہوئے دیکھنے لگے تھے۔

ان کے دیکھتے ہی دیکھتے غلیم نے دونوں روٹیاں نکال لیں۔ انہیں جھاڑا اور وہیں بیٹھ کر انہیں چبانے لگا۔ کتا غصے میں کھڑا ہو گیا تھا اور زور زور سے بھونک کر اپنا حق چھین جانے پر بھونکنے لگا۔ غلیم نے اسے دو ایک بار پچکار کر بلایا۔ کتا خاموش ہو گیا اور غلیم کے قریب ہو کر دم ہلانے لگا۔ غلیم اس تیزی سے خشک روٹی چبانے لگا جیسے برسوں کا بھوکا ہو۔



وہ بوڑھا جو بیساکھیوں کے سہارے چل رہا تھا آہستہ آہستہ غلیم کی طرف بڑھا  
اس کے پیچھے وہ لڑکا اور لڑکی بھی تھے۔ غلیم کے پاس آکر اس بوڑھے نے پوچھا۔

اے نوجوان! تم کون ہو؟

تیزی سے خشک روٹی چباتے ہوئے غلیم نے جواب دیا۔ انسان ہوا اور خدا  
کی تلاش میں نکلا ہوں۔ لیکن وہ مجھے کہیں نہیں ملا۔

اس بوڑھے کا سر تھوڑی دیر کو جھکا پھر وہ گھمیر سی آواز میں بولا۔

کیا تم نہیں مانتے کہ تم بھوکے تھے اور اسی خدا نے تمہیں اس درخت کے

نیچے سے دو روٹیاں مہیا کیں تاکہ تم اپنی زندگی کی ڈور پکڑ سکو۔

یہ تو میں نے اس کتے کا حق چھینا ہے اور ایک روز میں اسے اس کا صلہ

ضرور دوں گا۔

تمہارا نام کیا ہے؟

غلیم!

کہاں رہتے ہو؟

میرا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔

بوڑھا شفقت سے بولا۔

باہر سردی ہے۔ اندر آ جاؤ۔

روٹی کا آخری ٹکڑا چباتے ہوئے غلیم نے کہا۔

تمہارے پاس بیٹھ کر مجھے دیر ہو جائے گی جیکہ مجھے یہ سردرات گزارنے

کے لیے ابھی کوئی ٹھکانہ بھی تلاش کرنا ہے۔

ہم تینوں اس مندر میں رہتے ہیں۔ تم بھی اسے اپنا ٹھکانہ سمجھو اور یہیں رہ جاؤ۔ کیا تم مجھے یہاں سے نکال تو نہ دو گے؟ نہیں یہاں تم میرے بیٹے بن کر رہو۔ بوڑھے نے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا آؤ میرے ساتھ۔

وہ تینوں غلیم کو کے کر مندر کے اسی کمرے میں داخل ہوتے۔ غلیم نے دیکھا کمرے کے اندر تین چار پائیاں لگی تھیں۔ اور دائیں طرف کچھ جگہ خالی پرٹی تھی۔ جہاں ماد مویم اور ڈھونگ پڑے تھے۔ ان تینوں کے ساتھ ایک بستر پر بیٹھتے ہوئے غلیم نے پوچھا۔

تم تینوں اس مندر میں کیوں رہتے ہو۔

بوڑھا اس کے سامنے بیٹھتا ہوا بولا۔ میرا نام شیم کمار ہے لیکن اکثر لوگ مجھے شامو ہی کہتے ہیں۔ میں جیکب آباد کا رہنے والا ہوں۔ پھر اس نے رٹ کے اور رٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ آفتاب اور رفعت ہیں۔ ان کا باپ امرتسر سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ اور اس مندر میں رہنے لگا تھا۔ اس کی بیوی مر گئی اور اس نے ان دونوں بچوں کو ماں کی طرح پالا تھا۔ میں تصویریں بنانے کا کام کرتا تھا۔ جیکب آباد سے میں لاہور آیا اور اتفاقاً میری ملاقات اچھے باپ سے ہوئی بالکل اسی طرح جس طرح تم آج مجھے ملے ہو۔ میں یہاں رہ کر سینما کے پوسٹر بنانا رہتا تھا۔ لیکن میری بد قسمتی کہ میں نقرص کے مرض میں مبتلا ہو کر اپاہج ہو گیا اور ان دونوں



کا باپ ایک حادثہ میں مر گیا۔ یہ باہر جوڑا تھ سے کھینچنے والی رہڑی کھڑی ہے۔ یہ ان کے باپ کی ہے۔ بچہ ارہ محنت مزدوری کر کے بچوں کا پیٹ پالا کرتا تھا۔ اب یہ دونوں بچے میرا سہارا ہیں۔ آفتاب ایک ہوٹل میں سپاس روپے پر بہرہ گری کرتا ہے اور رفعت ایک صاحب کے ہاں ملازمہ کا کام کرتی ہے اور یوں ہمارا گزارہ چل رہا ہے۔ اب تم اپنے متعلق کچھ ہو۔

عظیم نے تھوڑی دیر سر جھکاتے رکھا۔ پھر اس نے اپنی بدبختی کی داستان کہنی شروع کی۔ جب وہ اپنی کہانی سنا چکا تو اس نے دیکھا۔ بوڑھا شامو، رفعت اور آفتاب رو رہے تھے۔ شامو نے آنسو پونچھ کر بڑی ہمدردی سے کہا۔

تم ہم سے بھی زیادہ حالات کے ستائے ہوئے ہو۔ لیکن ہم سب مل کر اگر کوشش کریں تو ہم ایک خاندان کے افراد کی طرح اس بوسیدہ مندر کو ایک پردہ رونق اور آباد گھر کی شکل دے سکتے ہیں۔ تم اچھے بھلے پڑھے لکھے ہو کوشش کرو کہیں نہ کہیں سروس مل ہی جاتے گی۔

عظیم نے اپنا جھکا ہوا سر اُپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

یہ باہر جوڑ رہڑی کھڑی ہے۔ کل سے میں اس پر کام شروع کر دوں گا۔ امید ہے میں خالی ہاتھ نہ آیا کروں گا۔ میں تینوں کا سہارا بن جاؤں گا۔ آج سے تم میرے باپ کی جگہ اور یہ دونوں میرے بھائی بہن ہیں۔

رفعت پہلی بار بولی۔ بھیا آپ کو ابھی بھوک ہو گی۔ میں آفتاب کو بھیجتی ہوں ہوٹل سے روٹیاں لے لےتا ہے۔ سالن ہمارے پاس ہے۔ عظیم نے بڑی شفقت

سے کہا نہیں میری بہن میں اب پیٹ پھر چکا ہوں۔ رفعت نے آفتاب سے کہا۔  
 آؤ آفتاب دوسرے کمرے سے بھیتا کے لیے چار پائی لے آئیں۔ دونوں بہن  
 بھاتی مندر کے دوسرے کمرے سے جا کر عظیم کے لیے چار پائی اور بستر لے آئے۔  
 اسی کمرے میں انہوں نے عظیم کے لیے چار پائی لگا دی اور رفعت نے اس پر ایک  
 صاف ستھرا بستر بچھا دیا۔ چاروں اٹھ کر اپنے بستروں پر آرام کرنے لگے۔ مندر سے  
 باہر تیز زمستانی ہوا آئیں بھوکے لو کی طرح چیختی چلاتیں واویلا کر رہی تھیں۔

---





خدا ہے۔۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔۔ کیسا خدا ہے۔۔۔۔۔ کون خدا ہے۔۔۔۔۔  
یہ دنیا۔۔۔۔۔ یہ دنیا نور و ظلمات کی کشاکش اور ستیزہ کاری کے علاوہ کچھ  
بھی نہیں۔ یہ کائنات چل رہی اور خود بخود اپنے محور کے گرد گردش کرتی رہے گی۔

کوئی اس کا چلانے والا، کوئی نگہبان اور کوئی محافظ نہیں ہے۔

رفعت کا سر جھک گیا اور وہ اداس ہو گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس معصوم بچی کا دل غلیم کی باتوں سے ٹوٹ گیا ہو۔ اسی وقت بوڑھا شامواپنی بسا کھینوں کے سہارے چلتا ہوا غلیم کے پاس آیا اور بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

یوں نہ کہو بیٹے! یہ گناہ ہے۔ خدا ہے۔ ہر مذہب میں کسی نہ کسی صورت کے اند خدا کو مانا جاتا ہے۔ کوئی اسے خدا اور رحیم کہتا ہے کوئی رام، بھگوان، پریشور اور الیٹور جانتا ہے۔ کوئی اسے گاڈ اور کوئی یزدان کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ سب ایک ہی ہستی کے نام ہیں جو اس کائنات کا خالق و مالک ہے۔

غلیم نے کوئی جواب نہ دیا اور دھڑی کھینچتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ سیدھا اجیری منڈی آیا۔ وہاں پہلے بھی بہت سے دھڑیوں والے کھڑے تھے۔ وہ بھی سڑک کنارے بجلی کے ایک کھمبے تلے کھڑا ہو گیا۔ کوئی دو گھنٹے بعد ایک بوڑھا اس کے پاس آیا اور بڑی ملالت سے پوچھا۔

چلو گے بھائی؟

غلیم چو کھا ہو گیا۔

کہاں جائیں گے؟

قلعہ گوجر سنگھ۔

سامان کیا ہے۔

بس مختلف چیزیں کی پانچ بوریاں ہیں۔



کیا دیں گے ؟

تم کیا لو گے ؟

غظیم کو چونکہ اس کام کا تجربہ نہ تھا۔ لہذا اس نے بات اسی پر ڈال دی۔ آپ ہی بتادیں کیا حرج ہے۔

دس روپے دے دوں گا۔

غظیم رہبری کھینچ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ چلتے چلیں۔ اکبری منڈی کے اندر جا کر غظیم نے خود پانچ بوریاں اٹھا کر اپنی رہبری میں رکھیں اور اس بوڑھے کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اونچے نیچے راستوں میں رہبری کھینچنا بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ وزن کافی تھا اور غظیم سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گیا تھا۔

قلعہ گوجر سنگھ میں سامان اتار کر وہ فارغ ہی ہوا تھا کہ ایک لڑکے نے اسے روک کر پوچھا۔ خالی ہو ؟

کر سیدھی کر کے لمبا سانس لیتے ہوئے غظیم نے کہا۔

خالی ہوں۔

یہاں سے سیمینٹ کی صرف چار گتھیاں ایجنسی سے لیکر فلمنگ روڈ پر جانا ہے صرف ایک فرلانگ کا فاصلہ ہے۔ بولو کیا لو گے۔

غظیم نے پہلی بار سودا طے کیا۔ پانچ روپے دے دیں۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔ آدھے پھر میرے ساتھ غظیم اس کے ساتھ چل پڑا سیمینٹ کی ایک ایجنسی سے اس نے سیمینٹ کی گتھیاں لادیں اور فلمنگ روڈ جا کر اتار دیں۔ یوں دوپہر تک اس

نے پندرہ روپے کمائے تھے۔

فلمنگ روڈ سے سرکلر روڈ کی طرف جاتے ہوئے وہ اپنے اسی مندر کے قریب سے گزرا جواب اس کا ٹھکانہ اور رہائش تھی۔ ایک ہوٹل کے سامنے وہ ٹھٹک کر رک گیا ہوٹل کے باہر وہی کتا کھڑا تھا جس کی دبائی ہوئی دو روٹیاں املتاس کے تنے کے قریب سے نکال کر اس نے کھائی تھیں اس کتے کے قریب ایک اور کتا بھی کھڑا تھا اس سے موٹا اور خوب توانا تھا۔ ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھانے والوں میں سے جب کوئی ان کی طرف ہڈی یا روٹی کا لقمہ پھینکتا تو دونوں کتے اسے حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھتے۔ لیکن کمزور کتا جب ہڈی یا روٹی کے ٹکڑوں سے قریب ہوتا تھا تو وہ توانا اور طاقت ور کتا غرا کر اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتا تھا اور یوں ہر بار وہ کمزور کتا اپنی دم اپنی پھلی دونوں ٹانگوں میں دبا کر بڑی ہی مایوسی کے عالم میں پیچھے ہٹ جاتا تھا۔

عظیم کے ذہن میں ایک خیال نے ٹھوکر لگائی۔ ان کتوں کی طرح بیسیویں صدی کے انسانوں کا بھی یہی عالم ہے ہر طاقت ور کمزور سے چھینا چھٹی کر رہا ہے پھر ان کتوں اور بیسیویں صدی کے ان زندگ آلود انسانوں میں کیا فرق؟

عظیم نے کچھ سوچا اور ہوٹل میں داخل ہوا۔ بھڑکی کی ایک پلیٹ اور چار روٹیاں لیکر وہ باہر آیا اور اپنی رہبری کے پتے کے ساتھ ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اس کمزور کتے کو بچکا کر بلایا۔ وہ بھی شاید عظیم کو پہچان گیا تھا۔ لہذا دم ہلاتا ہوا اور اپنے جسم کے پچھلے حصے کو خم دیتا ہوا عظیم کے قریب آیا۔ زمین پر



اپنی اگلے دونوں پاؤں کچھا کر وہ بیٹھ گیا۔ اپنی دم زور زور سے وہ ہلانے اور نیچے زمین پر مارنے لگا۔ عظیم نے دو روٹیاں اس کتے کے آگے ڈال دیں اور وہ خود کھانے لگا۔ اپنے دونوں پنجوں میں روٹیاں دبا کر کھاتے ہوتے وہ کتابا بار بار کچھ ایسی آنکھوں سے عظیم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جن میں تشکر ہی تشکر تھا۔

کھانا کھا کر عظیم اٹھا اور دوبارہ اپنی رہٹری کھینچنے لگا۔ وہ ابھی چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ رُک گیا اور مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا وہ کتابا بھی اس کے پیچھے آ رہا تھا اس نے رہٹری چھوڑ دی اور کتے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میرے ساتھ کیوں آ رہے ہو۔ بیوقوف! تمہارا اس ہوٹل میں ٹھکانہ تو ہے نا میں تو بالکل ہی بے آسرا انسان ہوں۔ میری ایک بھلائی کے بدلے میں تم کیوں میرے پیچھے آ رہے ہو جاؤ واپس چلے جاؤ اور اسی ہوٹل میں اپنے پیٹ کا دودھ بھرتے رہو۔

کتا دم ہلا کر آگے بڑھا اور عظیم کے پاؤں چاٹنے لگا۔ کتے کے اس سلوک پر عظیم کے ذہن میں نہ جانے کیا سمائی وہ وہیں بیٹھ گیا اور کتے کے سر پر ہاتھ پھیر کر پیار کرتے ہوئے کہا۔ شاید میری طرح تمہارا بھی کوئی خدا نہیں ہے۔ چلو پھر آ جاؤ میرے ساتھ آج سے تم میرے بھائی ہو اور تمہارا نام قیصر ہے۔ عظیم دوبارہ رہٹری کھینچنے لگا اور کتابا جس کا نام اس نے قیصر رکھ دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ عظیم ابھی اپنے مندر کے قریب ہی تھا کہ ایک کارٹرک کے فٹ پاتھ کے ساتھ بالکل اس کے قریب آ کر رُک گیا اور ٹھٹک کر ادھر دیکھنے لگا۔ کار میں سے

کمل اتری تھی۔ وہ مذاق برق لباس پہنے ہوئے تھی۔ عظیم اسے دیکھتا رہ گیا۔ کمل نے بھی اسے دیکھا پر دوسری طرف منہ پھیر کر آگے نکل گئی۔ عظیم نے اس کا تعاقب کیا۔ وہ اسی یونما عمارت میں داخل ہوئی جس کے صحن میں مندر تھا۔ عظیم گیٹ کی اوٹ میں کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ کمل عمارت کی سیڑھیاں چڑھی اور دوسری منزل کے کمروں میں کہیں گھس گئی۔

عظیم کا ٹوٹا ہوا دل اور چور چور ہو گیا تھا۔ ہر چیز سے اسے نفرت اور بیزاری سی ہونے لگی تھی۔ زندگی میں اب رہ بھی کیا گیا تھا۔ وہ تو کمل کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ پر اس نے بھی آنکھیں پھیر کر اجنبیت کا اظہار کر دیا تھا۔ بچا رہ طوفان کے ہاتھوں بچھ جانے والی شمع کی مانند ہو گیا تھا آہستہ آہستہ وہ اپنی رہی کے پاس آیا اور بدولی سے اسے کھینچنے لگا۔

شام تھکا ہارا وہ اس یونما عمارت میں داخل ہوا۔ رہی نے اس نے املتاس تلے کھڑی کر دی اور خود رہی کے پیہے سے ٹیک لگا کر وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ کتابھی اس کے پاؤں کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ عظیم نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور ستانے لگا تھا۔ تھک گیا تھا۔ بچا رہ۔ زندگی میں کبھی ایسا کام جو نہ کیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر بلایا اور بے حد ہلاوت آمیز آواز میں اسے پکارا۔

بھیا! — عظیم نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ رفعت اسے پکار رہی تھی۔ وہ کوئی جواب دینے والا تھا کہ رفعت پھر بولی۔



آپ یہاں کیوں بیٹھ گئے جیسا اندر چلتے نا۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ رفعت کی باتوں سے  
عظیم کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی بہن عطیہ اسے پیار سے پکار رہی ہو۔ اس کی آنکھیں  
ننکا ہو گئیں جنہیں پونچھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

تھک گیا ہوں میری بہن!  
رفعت نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔

آپ اندر تو چلتے نا۔ پھر میں آپ کی تھکاوٹ کا بندوبست کرتی ہوں۔ عظیم اس  
کے ساتھ اٹھ کر مندر کی اس زندان نما مرطوب کوٹھڑی میں آیا۔ اندر شاموں دیوار سے  
ٹینک لگائے کھانس کھانس کر حقہ پی رہا تھا۔ اس کے پاس آفتاب بیٹھا تھا۔ دونوں  
کے درمیان دیکھتے ہوئے کوٹھڑی کی انگیٹھی رکھی تھی۔ عظیم کو دیکھتے ہی شامو نے کہا۔  
تم آگے بیٹھے! ادھر میرے پاس آکر بیٹھو! عظیم شاموں کے پاس بیٹھ گیا اور  
آگ کے اُپر ہاتھ پھیلا دیئے۔ شاموں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔  
کوئی مزدوری ملی ہے بیٹے!

عظیم نے جیب سے بیس روپے نکال کر شاموں کی طرف بڑھا دیئے۔ باتیں  
روپے کاتے تھے بابا! جن میں سے دو روپے کی روٹی دوپہر کو کھالی تھی اور یہ بیس  
روپے بچے ہیں۔

شاموں نے رفعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

گھر کا خرچہ تو رفعت ہی چلاتی ہے بیٹے! یہ اسے ہی دے دو۔ عظیم نے  
نوٹ رفعت کی طرف بڑھا دیئے۔ رفعت نے روپے لیے اور پانچ روپے کا ایک

نوٹ واپس عظیم کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

یہ پانچ روپے اپنے پاس رکھیں بھتیّا۔ یہ آپ کا روز کا خرچہ ہے۔ کام کرتے کرتے آپ تھک جاتے ہیں کچھ کھاپی لیا کریں۔ ایکدم عظیم کا رنگ لال سرخ ہو گیا اس کی حالت اس مجرم جیسی ہو گئی تھی جسے جکڑ کر قتل گاہ میں کھڑا کر دیا گیا ہو۔ اسے اپنی ماں یاد آگئی تھی اس نے بھی تو ایک بار اس کی جیب میں بیس روپے ڈالتے ہوئے کہا: ”سارا دن کام کرتے رہتے ہو کچھ کھاپی لیا کرو“ عظیم کی گردن جھک گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کی گود میں گرنے لگے۔

شاموں اور آفتاب پریشان ہو گئے۔ رفعت آگے بڑھی اور عظیم کے گھٹنے پر پیار سے ٹھوڑی رکھتے ہوئے اسے پکارا۔

بھتیّا!

عظیم خاموش رہا اور اس کے آنسو بہتے رہے۔

رفعت نے اس بار بڑے دُکھ اور کرب سے کہا۔ بھتیّا! میں آپ کی بہن آپ کو بلا رہی ہوں۔ عظیم نے آستین سے آنکھیں پونچھیں اور سر گھا کر رفعت کی طرف دیکھا۔ رفعت نے روتی ہوئی آوازیں پوچھا۔

آپ دوئے کیوں ہیں بھتیّا۔

لرزاں اور پھٹی آوازیں عظیم نے کہا۔

مجھے میری ماں یاد آگئی تھی۔ وہ بھی اسی طرح میری جیب میں روپے ڈال کر کہا کرتی تھی۔ کچھ کھاپی لیا کرو جس طرح آج تم نے کہا ہے۔



رفت کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

کیا میں آپ کی بہن نہیں ہوں؟

عظیم نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ تم میری بہن ہو۔

رفت عظیم کی چھاتی سے لپٹ گئی۔ بھیا! عظیم نے اسے لٹایا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے رفت کے سر پر گر رہے تھے۔ رفت بچاری رو رو کر عظیم کا دامن بھگو رہی تھی۔ شاموں اور آفتاب نے منہ دوسری طرف کر لیے تھے اور ہلکی ہلکی ہچکیوں میں وہ بھی رو پڑے تھے۔ پرانے اور قدیم مندر کی اس ٹھٹھری کی فضا مغموم ہو گئی تھی۔

رفت نے علیحدہ ہو کر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

میں آپ کے لیے پانی گرم کرتی ہوں بھیا! آپ نہالیں ساری تھکاوٹ دور ہو جائے گی۔ رفت جب باہر نکلنے لگی تو عظیم نے اسے پکارا۔  
سنو منی! رفت رک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

عظیم نے پھر پوچھا۔ تم دونوں کچھ بڑھے رکھے ہی ہو۔

میں نے تو آٹھویں پاس کر کے چھوڑ دیا تھا بھیا! اور آفتاب آٹھویں سے اٹھ گیا تھا۔

تم دونوں بہن بھاتی پھر سکول میں داخلہ لو۔ میں تم دونوں کو پڑھاؤنگا۔ اور تمہارے سارے اخراجات پورے کرونگا۔ تم کسی کے ہاں ملازمہ کا کام نہ کرو گی۔ میں تمہارا بھاتی ہوں۔ اور ایک بھاتی کے لیے یہ بات شرم کی ہے کہ اس کی بہن

لوگوں کے ہاں کام کرتی پھرے۔ پھر اس نے شاموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 بابا! تم دونوں بہن بھائی کو کل پھر سکول میں داخل کرانے کا بندوبست کرو۔ میں  
 تم تینوں کے اخراجات پورے کرونگا۔ شامو کے چہرے پر اطمینان کے رنگ بکھر  
 گئے تھے اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

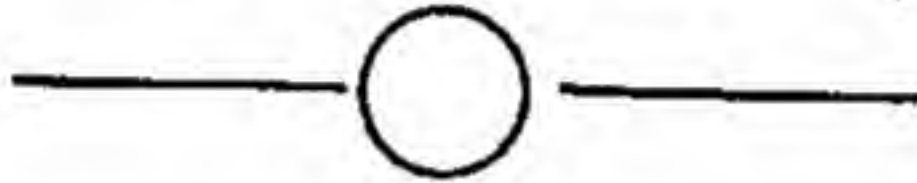
خدا تمہیں اس نیک کام کا صلہ دے گا۔ رفعت مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔  
 غلام نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

کوئی خدا نہیں ہے بابا! ہر کوئی اپنے مقدمہ کا نگہبان ہے۔ ہر انسان کی خودی  
 لا محدود اور لا انتہا ہے اور ایک لا انتہا سے وہ دوسرے لا انتہا کو مسخر کرتا ہے۔  
 ہر انسان ایک موسیقار ہے اور اپنی زندگی کی ساری دھنیں وہ خود مرتب کرتا ہے  
 ہر شخص پھیدو سے اور اندرائن کے اس پودے کی طرح ہے جو ریلی زمینوں میں  
 خود بخود اگتا، پھیلنا اور پھر خشک ہو جاتا ہے۔  
 شاموں نے اس کی نفی کی۔

یہ درست نہیں ہے بیٹے! یہ ساری کائنات ایک غزل ہے اور اس کے  
 اشعار اس غزل کے شعر ہیں۔ یہ گہرا، نیلا اور شفاف آسمان ایک خیابان ہے اور  
 تارے اس خیابان کے پھول ہیں اور پھر تم جانو کوئی غزل اور اس کے اشعار کسی  
 شاعر کے بغیر وجود میں نہیں آسکتے۔ کوئی خیابان اور اس کے پھول باغبان کے  
 بغیر پھل پھول نہیں سکتے۔ پھر تم ہی خود کرو میرے بیٹے! یہ زمین، آسمان۔ یہ پہاڑ  
 اور غزائے ہوتے سمندر اور پھر زمین اور سمندر کی تہ سے نکلنے والی قیمتی وحالتیں



اور مانع کیے بغیر کسی صنایع کے اپنے وجود میں آگئے۔  
 شاموں کی باتوں کا عظیم کوئی جواب نہ دے سکا۔ اتنے میں رفعت اندر آئی  
 اور عظیم کا بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔  
 چھوڑتیے اس بحث کو بھیتا۔ میں پانی گرم کر آئی ہوں۔ اٹھ کر نہا لیجئے پھر سب  
 مل کر کھانا کھاتیں۔ عظیم اٹھا اور چپ چاپ باہر نکل گیا۔





صبح سویرے ہی آدھا ناشتہ اس نے خود کیا اور آدھا اپنے کتے کو کھلانے کے بعد جب وہ اس یونما عمارت کے احاطہ سے نکلا تو اس کی نگاہیں سکول جاتی ہوئی ایک بچہ پر جم کر رہ گئیں۔ اس نے اپنا ہرڑہ ایک طرف کھڑا کیا اور اس بچہ کی طرف بھاگا۔ وہ سیبل تھی۔ کمل کی چھوٹی بہن۔ اس کے قریب جا کر غلیم نے اسے پکارا۔  
سیبل سیبل!

سیبل نے مڑ کر دیکھا۔ پھر بھاگی اور غلیم سے پیٹ گئی۔ بھیا! غلیم نے اسے پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

تم لوگ کہاں رہتے ہو بے بی!

سیبل کے اسی یونما دو منزلہ عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہم نے اس عمارت میں دو کمرے کرائے پر لے رکھے ہیں۔



ابو کہاں ہیں ؟

گھر ہیں ۔

اور باجی ؟

وہ بھی گھر ہیں ۔ شام کو جاتی ہیں ۔

کہاں ؟

ٹیوشن پڑھاتی ہیں نا ۔ ابو زیادہ بیمار ہو گئے ہیں ۔ ان کی سروس بھی جاتی رہی ہے ۔ اب باجی ہی مجھے پڑھا رہی ہے ۔ ابو کا علاج بھی کرا رہی ہے اور گھر کے اخراجات بھی میری باجی ہی چلاتی ہے ۔ چلو بیٹا میں آپ کو گھر لیکر چلوں ۔ ابو آپ کو بہت یاد کرتے ہیں ۔ غلیم اس کے ساتھ ہوا ۔ چلو ۔

غلیم جب اپنی دہڑی کھینچنے لگا تو سیبل نے پریشانی سے پوچھا ۔  
یہ آپ کی ہے بیٹا !

اس کی طرف دیکھے بغیر غلیم نے کہا ۔ ہاں بے بی ۔  
آپ کیا کام کرتے ہیں بیٹا ۔  
مزدوری کرتا ہوں بے بی ۔

سیبل اداس اور خاموش ہو گئی ۔ دونوں عمارت کے احاطے میں داخل ہوتے ۔ غلیم نے وہاں دہڑی کھڑی کی اور سیبل کے ساتھ ہوا ۔ دونوں بیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئے اور ایک کمرے میں داخل ہوئے ۔ سامنے ہی معمولی سی ایک کھاٹ پر فرانسس پڑے تھے ۔ ان کے پاس کمر بیٹھی تھی ۔ غلیم کو دیکھتے ہی فرانسس کے

نیلے نیلے بے جان ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ انہوں نے اٹھنا چاہا پر غلیم نے آگے بڑھ کر ان کی چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ لیٹے رہیے آپ کی صحت کبھی ہے فرانسس خاموش رہا۔ وہ جواب نہ دے پا رہا تھا۔ غلیم نے دیکھا اس کی بھی بھی سی آنکھوں سے آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک کر بستر پر گرنے لگے تھے پھر بڑے کرب کا اظہار کرتے ہوئے وہ بولے۔

مجھے تمہاری امی اور بہنوں کے مرنے کا بے حد دکھ اور صدمہ ہے۔

غلیم کا سر جھک گیا۔ وہ ضبط نہ کر سکا۔ پلکوں کی منڈھیر پر چند قطرے نمودار ہوئے پھر اس کی آنکھوں سے ٹوٹ کر پانی بہہ نکلا اور وہ بچوں کی مانند پھکیاں لے کر رونے لگا۔ فرانسس کل اور سیبل بھی رو رہے تھے۔

فرانسس سنبھلا اور نجیف آواز میں پوچھا۔

کل نے مجھے تمہارے پورے حالات بتائے تھے کہ قیصر سے تمہارا جھگڑا ہوا تھا اور تم پاگل ہو گئے تھے۔ پھر تم گھر سے ہی کہیں چلے گئے۔ کل تمہارے ہاں جاتی رہی ہے۔

غلیم کا ضمیر اند ہی اندر چلا اٹھا۔

میں تھوڑا ہی گھر سے چلا گیا تھا۔ کل نے ہی ملنا ترک کر دیا تھا۔ میں تو آج تک اُس کی تلاش اور جستجو میں سوکھے پتے کی طرح بھٹکتا رہا ہوں۔

فرانسس پھر بولا۔

کہاں چلے گئے تھے۔



غلیم نے سر جھکاتے رکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔  
 فرانسس نے پھر اسے چونکایا۔ بولتے کیوں نہیں۔ کہاں رہتے ہو آجکل؟  
 اسی عمارت کے احاطے میں جو مند رہے اس میں رہتا ہوں۔ وہاں تین دکانیں  
 اور حالات کے ستاتے ہوئے افراد رہتے ہیں۔ ان سے راہ رسم ہو گئی تھی اور اب میں  
 ان کے پاس ہی رہتا ہوں۔

کیا کام کرتے ہو۔

ٹھیک لکھنچتا ہوں اور مزدوری کرتا ہوں۔

فرانسس کی آواز ڈوب کر رہ گئی۔ کب تک ایسے کام کرتے رہو گے۔

غلیم کا سر پھر جھک گیا۔ جب تک سانس میں سانس ہے۔

قیصر اور عاصف کہاں ہیں؟

اپنے گھر رہتے ہیں۔

فرانسس خاموش ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ نہ جانے وہ کن سوچوں میں الجھ  
 گیا تھا۔ غلیم نے پہلی بار پر شکوہ اور جواب طلب نگاہوں سے کل کی طرف دیکھا۔ کل  
 کے چہرے پر وہی پرانی اجنبی کی سند تھا اور اٹھار کی سی خوبصورتی تھی۔ وہی گہری گھنی  
 پلکوں والی شفاف اور موٹی سیاہ آنکھیں اور اس کے جسم سے وہی جگلی پھولوں کی  
 سی پرانی مہک اٹھ رہی تھی۔ وہی اطالوی والکن کی طرح نازک اور پھریا بدن  
 تھا۔ تاہم اس کا چہرہ اور اس تھا۔ پچھلے پہر کے نزدیک چاند کی طرح۔ وہ یوں بیٹھی تھی گویا  
 اس میں روح نہ ہو اور۔۔۔۔۔ اور وہ کنواری مریم کا حسین مجسمہ ہو۔ محسوس

ہوتا تھا۔ گویا اس سے کسی نے اس کی زندگی کا سیدہ پن چھین لیا ہو۔ کل نے بھی سرگھسا کر عظیم کی طرف دیکھا۔ عظیم کو لگا جیسے کل کی نگاہیں منجمد ہوں اور اس کی آنکھیں جن میں کبھی بجلی کے ققمیوں کی ہنسی اڑانے والی چمک ہوا کرتی تھی۔ آج وہی چمک اداس اور سرد لگ رہی تھی۔

فرانسس کی آواز پھر ابھری جیسے وہ طویل غنودگی کے بعد بیدار ہوتے ہوں انہوں نے کل سے کہا۔

کل! چاتے ہی بنا لاؤ بیٹی!

کل نے اپنا آپ سیٹا اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔ فرانسس اور عظیم وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ سیسل عظیم سے اجازت بیکر سکول چلی گئی تھی۔

حقوڑی دیر بعد کل پھر اس کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چلتے کاکپ اور دوسرے میں بسکٹ کی پلیٹ تھی۔ اس نے عظیم کو چاتے تھمائی۔ اس کے نازک ہاتھ کانپ رہے تھے پھر اس نے بسکٹ کی پلیٹ عظیم کے سامنے تپائی پر رکھ دی اور باہر نکل گئی۔

عظیم نے خاموشی سے چاتے پی اور کھڑا ہوتا ہوا فرانسس سے مخاطب ہوا۔ مجھے اب اجازت دیجئے۔ میرا ٹھیلہ نیچے کھڑا ہے۔ میں اب آتا رہوں گا۔ فرانسس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

جاؤ۔ پر پہلے کی طرح پھر کہیں کھو نہ جانا۔ بیٹھے ابیں روت کے منہ میں ہوں۔ میرے بعد خدا کے علاوہ کل اور سیسل کے تو ہی آسرا ہو۔



عظیم پھر اس ہو گیا۔ تاہم وہ کمرے سے نکلا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ کل اسے کہیں دکھائی نہ دے رہی تھی۔ وہ دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں کل بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔ عظیم اس کے پاس آکھڑا ہوا۔ کل نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ عظیم نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

کل! اس روز تم کس کی کار سے اُتری تھی۔

کل نے نگاہیں بھر کر عظیم کی طرف دیکھا۔ پھر بے تعلقی سے کہہ دیا۔ آپ کو اس سے کیا۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ مجھ سے جواب طلبی نہیں کر سکتے۔ عظیم حقوڑی دیر تک اسے رحم طلب نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر لڑکھڑاتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔ کل کے رویے نے اس کے ذہن پر شدید ضرب لگائی تھی۔ اس کا رنگ سرسوں کی پیلاہٹ ہو گیا تھا۔ تیزی سے بیڑھیاں اترتے ہوئے وہ بڑی مشکل سے گرتے گرتے بچا تھا نیچے آکر اس نے اپنا ٹھیلہ پکڑا اور اسے کھینچنے لگا۔ اس کا کتا اس کے ساتھ تھا۔

کل اپنے کمرے سے بھاگتی ہوئی نکلی تھی اور آخری بیڑھی کے قریب دیوار کی ادٹ میں ہو کر عظیم کو دیکھنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ رو رہی تھی۔ عظیم جب بیڑا کھینچا ہوا باہر نکل گیا تو دیوار پر زور سے سر مارتے ہوئے کل نے تکلیف دہ احساس کے ساتھ کہا۔

میرے عظیم! اگر تم آسیر میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اور پہلے کی طرح مجھ سے محبت کرتے ہو پھر بھی میں اب تمہارے قابل نہیں رہی۔ میں لٹ چکی ہوں میرے عظیم! بیویوں

صدی کی تہذیب کے کھر درے ہاتھوں نے مجھے برباد کر دیا ہے۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی تھی میں — میں بک چکی ہوں میرے عظیم! میں بک چکی ہوں۔  
عظیم اپنی دھن میں ٹھیکہ کھینچا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا ذہن منتشر تھا۔ کل کے رویے پر اندر ہی اندر اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اس کا ذہن زور سے چلایا۔  
میرے ساتھ ہر کسی نے دھوکہ ہی کیا ہے۔

ذہن کا کوئی تاریک اور قسادت پسند پہلو بیدار ہو کر بولا۔ کہیں ڈوب مرو۔  
خودکشی کر لو ہر دکھ سے چھٹکارا مل جاتے گا۔ عظیم نے سر کو زور سے جھٹک دیا۔  
ہرگز نہیں۔ میں محنت کروں گا۔

آنتھک محنت جو کبھی بے ثمر نہیں رہتی۔ میں اپنے آپ کو تنہا زندہ رہنے کا  
عادی بنا لوں گا۔ سکول کی ایک عمارت کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ رک گیا۔  
اندر بچے ترقم کے ساتھ دعا پڑھ رہے تھے۔

تیرا رتبہ سب سے علی اسے خالق کون و مکاں  
تو ارض و سما کا والی اسے خالق کون و مکاں

ظاہر میں عیاں باطن میں نہاں  
اے شاہ جہاں تو یہاں نہ وہاں  
ہم تیرا نشان ڈھونڈیں تو کہاں  
ہے تیری شان نرالی اسے خالق کون و مکاں  
گلشن میں تیرا جلوہ دیکھ



پھولوں کی ادا بیل کی صدا

دیتی ہے پتہ یہ باد صبا

تو باغ جہاں کا مالی اسے خالق کون و مکاں

ہر فرد بشر تیرا دستنگ

تیرا دہے وہ درجہاں جھکتے ہیں سر

غظیم کی ذہنی کیفیت اور بگڑ گئی۔ اور اپنا ٹھیلہ کھینچتے ہوئے وہ زور

زور سے چلانے لگا۔

یہ جھوٹ ہے۔ کوئی کسی کا سوالی اور دستگر نہیں ہے۔ ہر کوئی اپنے اپنے

کردار کا مالک اور خالق ہے۔ کوئی خدا نہیں ہے۔ دنیا والوں میں تم سے پوچھتا ہوں: بتاؤ

خدا کہاں ہے؟

دوپہر تک اس نے مزدوری کی پھر لوٹ آیا۔ آج اس کا جی نہ نکلتا۔ کل

کے رویے نے اس کی جھلکی، کلیت، عمومیت اور اس کے تمام دکل کو توڑ کر رکھ

دیا تھا۔ تھک گیا تھا لہذا گھر لوٹ آیا۔ جب اس نے ٹھیلہ املتاس کے درخت

تیلے کھڑا کیا تو اس نے دیکھا مکمل کہیں جانے کے لیے بیڑھیاں اتر رہی تھیں۔ اتنے

میں شاموں بیساکھیوں پر لڑ کھڑا ہوا مندر سے نکلا اور پریشانی میں پوچھا۔

آج سویرے آگے ہو بیٹے!

غظیم فوراً ٹال گیا۔ ایک جگہ کام جانا ہے بابا!

شاموں نے خوشی کے اظہار میں کہا۔ میں آفتاب کو سکول داخل کر آیا ہوں

تم نے بہت اچھا کیا بابا !  
 رفعت بھی بھاگتی ہوئی باہر آئی اور پیار سے کہا -  
 آئیے بھائی جان پہلے کھانا کھائیے -  
 غلیم نے دیکھا کل باہر نکل گئی تھی - لہذا اس نے رفعت کو بھی ٹال دیا -  
 میں ایک جگہ کام سے جا رہا ہوں منی ! تھوڑی دیر تک آتا ہوں - وہ عمارت  
 کے احاطے سے بکلا اور بڑی راز داری سے کمر کا تعاقب کرنے لگا -  
 بڑی شرک پر آکر کل نے رکشا کر لیا - غلیم بھی رکشے میں اس کا تعاقب کئے رہا -  
 ایک پُر رونق اور بڑی شاہراہ پر کل رکشے سے اتر گئی - غلیم نے بھی رکشے کو فارغ  
 کر دیا - وہاں سے ایک ذیلی شرک پر کل تھوڑی دیر تک آگے گئی - پھر ایک کئی منزلہ  
 عمارت میں داخل ہو گئی - غلیم عمارت کے باہر کھڑا ہو کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا  
 اسی حالت میں کافی دیر ہو گئی - پھر غلیم نے دیکھا ایک کار اس عمارت کے سامنے  
 آکر رکی تھی اور اس سے ایک خوبصورت جوان اتر کر اس عمارت میں داخل ہوا تھا -  
 غلیم پھر انتظار کرنے لگا - آدھ گھنٹہ اور گزر گیا - پھر اسے کسی کے پٹرھیاں اترنے  
 کی آواز سنائی دی - غلیم پٹرھیلوں کے قریب ہی ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا -  
 کل اور اس کے ساتھ وہ جوان بھی جو کار میں آیا تھا - پٹرھیلوں سے باہر نکلے  
 تھے - کار کے نزدیک آکر اس نے جوان نے کل سے پوچھا -  
 اب کہاں جاؤ گی -  
 اپنے گھر -



نہیں میرے ساتھ چلو تھوڑی تفریح ہو جائے گی۔

کمل نے بے تعلق سے ہجے میں کہا۔ تم اپنا مطلب نکال چکے ہو۔ اب مجھ سے کیا چاہتے ہو اس جوان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

تم چیز ہی ایسی ہو جسے بھولا نہیں جاسکتا۔ چلو دونوں اکٹھے فلم دیکھتے ہیں پھر میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔

کمل نے آگے بڑھنا چاہا۔ نہیں مجھے گھر جانا ہے۔ اس نے جوان نے کمل کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی کار میں بٹھالیا۔ یوں ہی ضد نہیں کرتے پھر وہ خود بھی شیرنگ پر بیٹھ گیا اور کار آگے رینگ گئی۔

عظیم بچہ اُلجھ گیا تھا۔ ستون کی اوٹ سے وہ نکلا اور عمارت کی سیڑھیاں چڑھ کر اس عمارت میں داخل ہوا۔ ایک کمرے کے سامنے جس کے چہرے پر لکڑی کے ایک بورڈ پر موٹے حروف میں لکھا تھا "OFFICE" وہ رک گیا۔ اندر ایک خاتون جو اُدھیر عمر کی تھی، جس کے بال تراشیدہ اور جو شکل و صورت سے اینگلو انڈین لگتی تھی اس سے ہوئے آفس میں بیٹھی مگر سیٹ پھونک رہی تھی۔ عظیم جب آفس میں داخل ہوا تو اس عورت نے پوچھا۔

کیا بات ہے۔

عظیم اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں آپ سے ایک اہم مسئلے پر بات کرنا چاہتا ہوں۔

اس نے ایک لمبا کش لیکر کہا۔ کہو۔

یہ لڑکی جو ابھی ابھی ایک نوجوان کے ساتھ اس عمارت سے نکلی ہے اور جس کا نام کل ہے۔ میں اس کے متعلق جاننا چاہتا ہوں کہ وہ ایسا دھند اکب سے کرتی ہے۔ اس عورت نے خفگی میں کہا۔

تمہیں اس سے کیا۔

آپ ناراض نہ ہوں۔ مجھ سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں۔ وہ میرے ایک عزیز کی لڑکی ہے۔ بس میں اپنے ذہنی انتشار کو ختم کرنے کے لیے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کیسے اور کیوں ان حالات کا شکار ہوتی ہے۔

عورت ہچکیاتی — میں — عظیم نے منت و التجا کی مجھے مایوس نہ کیجئے —

اس عورت نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

سنو! میرا نام ڈور تھی ہے۔ میں اس کے متعلق اتنا ہی جانتی ہوں کہ اس کا باپ ایک عرصے سے بیمار ہے۔ وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے وہ ایک جگہ ٹیوشن پڑھاتی تھی۔ جس صاحب کے ہاں وہ پڑھاتی تھی۔ اس نے ایک روز جبکہ اس کی بیوی بچے کہیں دعوت میں گئے ہوئے تھے اس نے زبردستی کل کی عزت لوٹ لی۔ اس حادثے سے کل کا دل ٹوٹ گیا اور اسے مردوں سے نفرت سی ہو گئی پھر اسی محلے کا ایک بوڑھا جو میرا ایجنٹ ہے۔ اس نے اس لڑکی کو دیکھ لیا۔ لڑکی چونکہ ناقابل یقین حد تک خوبصورت ہے۔ لہذا اس بوڑھے نے بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس نے اسے اپنی بیٹی بنالیا۔



اور کہیں سروس دلانے کا وعدہ کر کے وہ اس لڑکی کے قریب ہو گیا اور لڑکی اکثر اس خیال سے اس کے پاس آنے لگی کہ اسے کہیں سروس مل جائے گی اور دوبارہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے گی۔

ایک روز اس بوڑھے نے بھی ایک صاحب سے پانچ ہزار روپیہ لیکر مکمل کو اپنے مکان کے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ پھر اس صاحب کو بلایا اور اس نے بھی زبردستی مکمل کی عزت لوٹ لی۔

یوں دوبارہ مردوں کے ہاتھوں لٹنے کے بعد مکمل کو مردوں سے انتہا کی نفرت ہو گئی۔ پھر وہ میری ایک اینجنٹ عورت کے ذریعے میرے ہاتھ چڑھ گئی۔ میں نے اسے اپنے حق میں اونچ نیچ سمجھائی اور اسے ترغیب دی کہ وہ عزت بیچ کر مردوں سے بھاری رقمیں وصول کرے اور یوں ان مردوں سے انتقام لے جنہوں نے اسے برباد کیا۔ اب وہ مردوں سے انتقام لینے کی خاطر عزت بیچتی ہے اور بھاری رقمیں وصول کرتی ہے۔

ہاں اس میں ایک صفت ہے۔ ایک بار عزت بیچنے کے بعد جب تک گھر کے اخراجات چلانے کی خاطر اس کے پاس رقم ہے وہ عزت نہیں بیچتی۔ جب خالی ہاتھ ہوتی ہے۔ میرے پاس چلی آتی ہے۔ بیشمار نوجوان اس پر مرتے ہیں۔ میں ان میں سے کسی کو فون پر اطلاع کرتی ہے وہ آتا ہے اور یہیں اس عمارت میں بھاری رقم کے عوض مکمل کی عزت لوٹ کر چلا جاتا ہے۔

تم اس سے کیا وصول کرتی ہو ؟

ٹین پر سنٹ ۔

تم اور کیا کام کرتی ہیں ۔

کل کی طرح میرے ہاتھ میں اور بہت سی لڑکیاں بھی ہیں ۔ میں انہیں ماڈل گراں ، فلم ایکٹر اگراں ، ڈانس اور طوائف کے روپ میں پیش کر کے کمیشن وصول کرتی ہوں ۔ یہ عمارت اصل میں رقص کی تربیت گاہ ہے اور کئی لڑکیاں یہاں ڈانس سیکھنے آتی ہیں ۔ ان میں سے بھی اکثر میرے کام آ جاتی ہیں اور یوں میرا دھندہ چلتا رہتا ہے ۔

تم ایک وعدہ کر دو گی ۔

کہو ؟

میری اس ملاقات کا ذکر کل سے نہ کرنا ۔

مجھے کیا ضرورت ہے ۔

غظیم کھڑا ہو گیا ۔ میں تمہارا مشکور ہوں ۔

دور تھی نے تینہبہ کی بسنو اگر تم نے اس عمارت کا راز کسی سے کہا ۔ تو پھر جان لینا تم زندہ نہ رہو گے ۔ میرا کوئی نہ کوئی ایجنٹ تمہیں ٹھکانے لگا دے گا ۔

مجھے کیا ضرورت پڑی ہے آپ لوگوں سے اُلجھتا رہوں ۔

غظیم سیڑھیاں اتر ا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا ۔ اس کے جسم کے سارے تار و پود

بکھر گئے تھے ۔ اس کی حالت اس کمزور چٹان جیسی ہو گئی تھی جسے سمندری لہروں نے وحشیانہ کشمکش کے بعد بھر بھرا کر دیا ہو ۔ کل سے محبت کی آگ نے اسے ایک لے جی



روگ میں مبتلا کر دیا تھا۔ کمل سے اسکی زخم خوردہ محبت نے اس کے تشخص تک و  
 طوفان کی طرح تار تار اور جھیر جھیر کر کے چھدرا کر رکھ دیا تھا۔  
 عظیم واپس مندر آیا۔ نہا کر اس نے کھانا کھایا۔ اور پہل قدمی کا بہانہ  
 کر کے وہ مندر کے ارد گرد گھوم کر کمل کا انتظار کرنے لگا۔ اندھیرا جب پھیل  
 گیا اور عمارت کی روشنیاں جل اٹھیں۔ کمل عمارت میں داخل ہوتی۔ عظیم  
 تیزی سے اس کی طرف پسکا۔ کمل جب سیڑھیاں چڑھنے لگی تو عظیم اس کا راستہ  
 روک کر کھڑا ہو گیا اور ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

جو راستہ تم نے اختیار کر رکھا ہے اس میں رسوائی ہی رسوائی ہے  
 اب بھی کچھ نہیں بگڑا سنبھل جاؤ۔ اگر یہ راز فاش ہو گیا تو تمہارے اوپر کیا  
 گزریگی۔ لوگ تم پر انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہیں گے کہ ————— کمل  
 نے عظیم کی بات کاٹ دی اور بے رخی سے کہا۔

مجھے کسی ناصح اور رہبر کی ضرورت نہیں اور پہلو بچا کر سیڑھیاں چڑھ  
 گئی۔ عظیم کا سر جھک گیا اور دل برداشتہ سا ہو کر مندر آ گیا۔



دوپہر کا کھانا کھا کر وہ ایک بار وفاق بازار کے کونے میں اپنے ٹھیلے کے پیچھے سے ٹیک لگا کر آرام کر رہا تھا۔ اس کا کتابچہ وہ اب قبضہ کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ اس کے پاؤں پر سر رکھے لیٹا ہوا تھا۔ کسی نے اسے قریب ہی سے پکارا۔  
اسے ٹھیلے والے !

غظیم کھڑا ہو گیا اور اپنی مچھلی ہوتی قبضہ درست کرنے لگا۔ سامنے ایک ادھیڑ عمر اور ملازم قسم کا آدمی کھڑا تھا۔ غظیم نے اس سے پوچھا۔  
کیا بات ہے ؟

چلو گے ؟ وہ سامنے والی دکان سے دو صوفہ سیٹ لیجانے ہیں۔



کیوں نہ چلونگا۔ اپنا تو دھندہ ہی یہ ہے۔ چلو۔ ٹھیلہ جب وہ کھینچنے لگا تو کتابھی اُٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ بوڑھے کی مدد سے اس نے دونوں صوفہ سیٹ دکان سے نکال کر اپنے رہڑے پر لا کر رسی پھیر دی اور بوڑھے سے کہا۔

بیٹھو ٹھیلے پر اور چلیں۔

بوڑھے نے ہمدردی سے کہا۔ نہیں نہیں۔ اس طرح بوجھ زیادہ ہو جائیگا۔ میں پیدل ہی چلونگا۔ نہیں بڑے میاں تم بیٹھو ٹھیلے پر۔ غریب کو کھینچتے ہو تے میں فخر محسوس کرونگا۔ تمہارے بیٹھنے سے میری ساری تھکاوٹ جاتی رہے گی۔ میں سمجھونگا۔ میں نے کوئی نیک کام کیا ہے۔ جس کے صلے کی میں کسی سے اُمید نہ رکھونگا۔ اگر تم میرے ساتھ پیدل چلے مجھ پر میرے ضمیر کا بوجھ اور زیادہ ہو جائیگا۔

بوڑھا مان گیا۔ اور عظیم نے اُسے سہارا دیکر رہڑے کے اُوپر بیٹھا دیا۔ عظیم نے رہڑہ کھینچنا شروع کر دیا اور بوڑھا اسے راستہ بتاتا جا رہا تھا۔ بوڑھا اسے ان راستوں پر لیجا رہا تھا جو اس کے اپنے گھر کی طرف جلتے تھے۔

گھر؟

جو اس کے لیے اب گھر نہیں۔ جہنم کی کوئی تاریک غار تھی جو اس کی ماں اور بہنوں کو نگل گئی تھی۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ اور اونچی نیچی سڑکوں

پر ٹھسلا کھینچنا مشکل ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اسی رفتار سے چلتا رہا اور بڑے  
کے جھول کھاتے ہوئے پہتے کھرڑ کھٹ کی آوازیں پیدا کرتے رہے۔  
غظیم کے اپنے گھر کے عین سامنے آکر اس بوڑھے نے غظیم کو روک جانے  
کے لیے کہا۔ غظیم رک گیا۔ کمریدھی کی اور پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے  
اس بوڑھے سے پوچھا۔

کس مکان میں لیکر جاؤ گے۔

بوڑھے نے غظیم کے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں  
تم کب سے یہاں رہتے ہو۔

میں ان کا ملازم ہوں۔ پچھلے چند ماہ سے یہاں ہوں۔ ٹھہرو میں گیٹ  
کھولتا ہوں۔ پھر دہڑہ اندر لے چلو۔ تم نے میرے ساتھ اتنا اچھا سلوک  
کیا ہے تو ایک اور مہربانی بھی کرتے جانا۔

کیا؟

یہ ساری چیزیں اٹھا کر اندر بھی رکھتے جانا۔ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ اکیلا  
اٹھانہ سکوں گا۔ میں کوشش کر دوں گا۔ تمہیں مزدوری زیادہ دلا دوں۔ اگر نہ  
دلا سکا تو مجھے معاف کر دینا۔ تم میرے بیٹے کی جگہ ہو۔

بوڑھے کی باتوں پر غظیم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھٹی ہوئی آستین  
سے اس نے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

بڑے میاں! تم ملازم ہو اور میں مزدور ہوں۔ اگر تم مجھے کچھ نہ



دو گے تو بھی میں مسکراتا ہوا چلا جاؤنگا۔ یہ سارا سامان تم جہاں کہو گے میں اکیلا اٹھا کر رکھ دوں گا۔ تم گیٹ کھولو۔

بوڑھے نے گیٹ کھولا اور عظیم اپنے گھر داخل ہوا۔ بوڑھے نے اسے یوکلٹس تلے رک جانے کو کہا اور خود اندر جاتے ہوئے کہا۔

میں آتا ہوں بیگم صاحبہ سے پوچھ آؤں یہ کس کمرے میں رکھوانے ہیں۔ بوڑھا اندر چلا گیا۔ عظیم اپنے مکان کا جائزہ لینے لگا۔ ماں اور بہنوں کے نہ ہونے سے مکان کیسا سرسام زدہ، اذیت دہ اور دوزخ نما لگ رہا تھا۔ اس کے اوپر یوکلٹس کا درخت ادا اس کھڑا تھا۔ وہی درخت جس تلے بیٹھ کر وہ پڑھا کرتا تھا۔ سامنے اس کا کمرہ تھا جس پر اب نئے اور پھولدار موٹے موٹے پردے لٹک رہے تھے۔ عظیم کے دل کے قصر سے ایک ہوک سی اٹھی اور اس کی آنکھیں پھر منناک ہونے لگیں۔

عظیم فوراً سنبھل گیا۔ اس کے سامنے اس بوڑھے کے ساتھ قیصر اور عاصفہ نکلے تھے۔ عظیم کو دیکھتے ہی عاصفہ کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ اس پر سبائی کیفیت طاری ہو گئی۔ آہستہ آہستہ وہ آگے بڑھی بالکل یوں جیسے وہ سحر زدہ ہو گئی ہو۔ اور اسی شہودی حالت میں قیصر کی موجودگی کی پرواہ کیے بغیر اس نے عظیم سے پوچھا۔

آپ یہاں اور اس حالت میں؟

عظیم نے کوئی جواب نہ دیا اس کے چہرے پر ابھی تک بریدہ رنگ اور

غموں کی گرد تھی۔ عاصفہ نے آگے بڑھ کر عظیم کا ہاتھ پکڑ لیا۔  
 آپ اندر آئیے۔ یہ گھر آپ کا ہے۔ آپ یہ کام کیوں کرتے ہیں۔  
 عظیم چونکا اور یوں سنبھلا جیسے ایک لمبی مسافت بھاگ کر تیرگی کے  
 ہجوم سے نکلا ہو۔ عاصفہ کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے اس نے ترشی سے کہا۔

کون ہو تم؟

عاصفہ نے بڑے رحم انگیز لہجے میں کہا۔

میں عاصفہ ہوں۔ مجھے پہچانیے جس کے ساتھ آپ اسی گھر میں رہا کرتے  
 تھے۔ اور جس کے آپ کبھی منگتے تھے۔ میں اقراء کرتی ہوں کہ قیصر سے شادی  
 کر کے میں نے غلطی کی ہے میری منزل آپ تھے۔ میں بھٹک گئی تھی۔ مجھے  
 معاف کر دیں۔ عاصفہ نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

قیصر اور بوڑھا ملازم عاصفہ کی گھٹکوسن کر پریشان ہو رہے تھے۔ عاصفہ  
 بچاوی کا بھی کیا قصور تھا۔ ریحانہ کی وجہ سے وہ عظیم سے دُور ہوتی تھی کہ  
 عظیم اس کی ہر بات مانتا تھا۔ اب جبکہ ریحانہ نہ تھی۔ یہ ایک جلی، فطری  
 خلقی فعل اور قدرتی، طبعی و اصلی عمل تھا کہ وہ دوبارہ عظیم کی طرف جھک  
 رہی تھی۔

عاصفہ کو نظر انداز کر کے عظیم نے بوڑھے سے کہا۔

بڑے میاں! تباہ یہ سامان کہاں رکھوں۔ بوڑھا عظیم کی طرف بڑھا۔  
 پہلے سارا سامان نیچے اتار د پھر بتاتا ہوں کہاں رکھنا ہے عظیم اپنے ٹھیلے



کی طرف بڑھا اور سامان کو پھیری ہوئی رسی کھولنے لگا۔  
 قیصر نے جانے کیا سوچا آگے بڑھا اور عظیم کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔  
 چھوڑ دیتے بھاتی جان! میں خود سامان اتارتا ہوں۔  
 عظیم نے انتباہی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔  
 دُور رہو مجھ سے۔ تم دونوں میرے لیے اجنبی ہو۔  
 قیصر چپ چاپ پیچھے ہٹ گیا۔ عظیم نے سارا سامان اتار کر نیچے  
 رکھ دیا۔ عاصفہ نے بوڑھے ملازم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ان کے لیے اندر فرج سے دو بوتلیں نکال لاؤ۔

بوڑھا ملازم بچارہ پریشانی اور حسرت سے عاصفہ کو دیکھے جا رہا تھا۔  
 عاصفہ نے دوبارہ بڑی قہرمانیت سے کہا۔ تم نے سنا نہیں مجھے کیا دیکھے  
 جا رہے ہو۔ یہ اس گھر کے مالک اور میرے منیجر ہیں۔ بوڑھا چپ  
 چاپ اندر چلا گیا۔

اسی لمحہ آسیہ اپنے گھر کی طرف سے بھاگتی ہوئی آئی۔ اس نے  
 بھی عظیم کو دیکھ لیا تھا۔ عظیم کے قریب آکر وہ بچاوی پر تاثر نگاہوں سے  
 اسے دیکھنے لگی۔ عظیم کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ فیض چٹھی ہوئی اور تیلون  
 میلی تھی۔ وہ گرد آلود پسینے میں شرابور تھا۔ اس کی ہیبت غم آلود تھی اور  
 اس کے چہرے سے انسانیت کش نظام کی پرچھائیاں تھیں۔ آسیہ  
 عظیم سے قریب ہوتی بڑی وارفتگی سے پوچھا۔ آپ گھر سے بھاگ

کیوں گتے تھے؟

عظیم خاموش کھڑا رہا اور کوئی جواب نہ دیا۔ آسیہ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو ہلایا میں آپ سے مخاطب ہوں۔ بولتے کیوں نہیں ہیں۔ پست و مضمل سی آواز ادنیٰ ولی سے اس نے جواب دیا۔

یہاں اگر میں کانٹوں پر پڑا رہتا تو میرا ذہن ہمیشہ کے لیے مجروح ہو جاتا۔ اب مجھے سکون ہے اور میں ایک نئی زندگی کی ابتدا کر لی ہے۔ اسی لمحہ بوڑھا ملازم دو بوتلیں لے آیا اور عظیم کی طرف بڑھائیں۔ عظیم انکار کر گیا۔

میں نہیں پیونگا بڑے میاں!

عاصفہ نے اس سے بوتلیں لے لیں اور عظیم کی طرف بڑھی۔ دونوں بوتلیں اس نے عظیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ پی لیجئے۔

عظیم نے دونوں بوتلیں تھام لیں۔ عاصفہ خوش ہو گئی۔ بسکن دوسرے ہی لمحے اس کی روح میں گویا تلخیاں گھول دی گئی ہوں۔ عظیم نے دونوں بوتلیں فرش پر پھینک کر ریزہ ریزہ کر دیں۔ اور پھر ادھر ادھر بکھرے ہوئے شیشے کے ٹکڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نے عاصفہ سے پوچھا۔

کیا تم ان شیشے کے ٹکڑوں کو دوبارہ جوڑ سکتی ہو۔ ایک بے اختتام



آہ بھرتے ہوئے عاصفہ نے کہا۔

نہیں۔

عظیم نے معاندانہ کھنک اور زہر بھرے انداز میں کہا۔

تو پھر سنو تمہاری طرف سے میرا ٹوٹا ہوا دل ان شیشوں کی مانند دوبارہ نہیں جڑ سکتا۔ اس گھر میں ————— اس گھر میں تم تیرگی کا، نجوم ایک سیاہ پتھر ہو جس سے روشنی نہیں چھوٹ سکتی۔ عاصفہ کا سر جھک گیا۔ عظیم نے اس بار بوڑھے ملازم سے کہا۔

بڑے میاں میری مزدوری لاؤ۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن سے میں اپنا مختانہ نہیں چھوڑ سکتا۔ عاصفہ ایک بار پھر اندر گئی اور اپنا پرس اٹھالائی۔ عظیم کے قریب آکر اس نے پرس کی زنجیر کھولی اور عظیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس میں پانچ ہزار روپیہ ہے جس قدر آپ کو ضرورت ہے لے لیں۔ عظیم نے دس روپے کا ایک نوٹ نکال لیا اور پرس اس نے فرش پر پھینکتے ہوئے کہا۔

میں صرف اپنی مزدوری لوں گا۔ میں تمہارا احسان مند کیوں بنوں۔ عظیم جب اپنا ٹھیلہ کھینچ کر باہر لیجانے لگا تو آسیہ اس کے سامنے آگئی۔ کہاں چلے ہیں۔

عزم آگئیں دھن میں عظیم نے جواب دیا۔ مزدوری کرنے۔ آسیہ نے

اس کے دونوں بازو تھام لیے اور الفاظ کی رقت میں کہا۔  
 ابو کلینک گئے ہوئے ہیں۔ ان کے آنے تک آپ نہیں جا سکتے  
 قیصر بھی آگے بڑھا اور عظیم کو روکتے ہوئے کہا۔  
 آپ یہیں رہیں بھائی جان! یہ آپ کا گھر ہے۔

برف جیسے ٹھنڈا لہجے میں عظیم نے کہا۔  
 بھائی بہن۔ تم مجھے بھاتی کہتے ہو۔ میں نے تمہارا نعم البدل تلاش کر لیا  
 ہے۔ تمہاری جگہ میں نے کسی اور کو بھاتی بنایا ہے دیکھنا پسند کرو گے۔  
 اس نے اپنے کتے کو پکارا۔

قیصر! قیصر! کتا اپنے جسم کا پچھلا حصہ دہرا کرتا اور دم ہلاتا ہوا،  
 عظیم کی طرف بڑھا اور اس کے پاؤں چاٹنے لگا۔ عظیم نے قیصر پر پھر لوہ  
 طنز کیا۔

دیکھا کیسا ساتھی ہے؟ تم سے ہر حال میں بہتر ہے۔ میں نے ایک  
 بار اسے روٹی کا خشک ٹکڑا ڈالا اور اس کے صلے میں میرے ساتھ اس  
 نے یہ رشتہ قائم کر رکھا ہے۔ پر تم؟۔ میں تمہیں اپنا خون دیتا رہا۔ اپنی  
 محنتوں کا ثمر تمہیں کھلاتا رہا۔ اور پھر تم نے ہی مجھے زہریلے سانپ  
 کی طرح ڈس لیا۔

عظیم جب دوبارہ ریڑا کھینچنے لگا۔ تو اسیہ اپنے دونوں بازو پھیلا  
 کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔



میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔

عظیم نے ایک سہجان کے عالم میں کہا۔

آسی! کیا تم چاہتی ہو میں یہاں ساری عمر کانٹوں میں پڑا رہوں۔ تم چاہتی ہو میں ساری عمر چنگاری کی طرح بھڑکتا رہوں۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ آسی پر میں یہاں رہ کر اپنی زندگی کا ضمیر زنگ آلود نہیں کرنا چاہتا۔ اس گھر کے اندر میری تقدیر کے پامال راستے ہیں جن پر میں دوبارہ چلنا نہیں چاہتا۔ اگر تمہیں مجھ سے ذرا بھی ہمدردی ہے تو میری راہ سے ہٹ جاؤ۔ آسیہ نے کچھ سوچا پھر ایک طرف ہو گئی۔ عظیم اپنا ٹھیلا لیکر باہر نکل گیا۔ سب گیٹ پر کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ سڑک کنارے کدیوں کے نلکے کے قریب اس نے ٹھیلا روکا اور جھک کر چلو سے پانی پینے لگا۔ اس کا کتا بھی حوض میں جمع پانی چاٹنے لگا تھا۔ آسیہ، عاصفہ اور قیصر اس کی یہ حالت دیکھ کر اور زیادہ غمزہ ہو گئے تھے۔

یکبارگی آسیہ اپنے گھر کی طرف بھاگی۔ گھیراج سے اس نے گاڑی نکالی اور سڑک پر لائی۔ عاصفہ اس کے سامنے آتی ہوتی بولی۔

کہاں چلی ہو آسی!

ان کا پیچھا کرونگی۔ اور دیکھوں گی کہاں رہتے ہیں یہ

دروازہ کھولتے ہوئے عاصفہ نے کہا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ دونوں آہستہ آہستہ کار چلاتی ہوئیں۔ دور دور رہ کر عظیم کا

تعاقب کرنے لگیں۔

آج پھر اسے چرکا لگ گیا تھا۔ لہذا وہ جلدی مندر لوٹ گیا۔ آسپہ اور عاصفہ مندر تک اس کا تعاقب کر کے چلی گئی تھیں۔ ابھی شام نہ ہوتی تھی ٹھیللا المٹاس نیچے کھڑا کر کے وہ بیڑھیاں چڑھا اور فرانسس کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اکیلے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ کمل اور سیبل شاید دوسرے کمرے میں تھیں۔ عظیم اس کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ فرانسس چند لمحوں تک اسے خاموشی سے دیکھتے رہے پھر کھوکھلی سی آواز میں پوچھا —

کمزور ہو گئے ہو؟

عظیم نے سر جھکاتے رکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ فرانسس پھر بولا۔  
شاید تم دن بھر ٹھیللا کھینچ کھینچ کر تھک جاتے ہو۔  
عظیم خلاؤں میں کھوہ گیا۔

مزدوری سے تو نہیں تھکتا۔ پر ان نامساعد حالات نے میری کمر توڑ دی ہے۔ یہ دور گنہگار ضمیر رکھنے والو کا ہے۔ کہیں بھی انسانیت کی گرمی نہیں رہی۔ لوگوں کا سلوک ایک دوسرے سے برف جیسا ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ اس دور میں جس سے محبت کی جاتے وہی رگ و پے میں نہ ہر گھول دیتا ہے۔  
فرانسس نے پھر پوچھا۔



روز کا کیا کما لیتے ہو۔

کبھی پچیس تیس، کبھی چالیس اور کبھی کچھ بھی نہیں۔ مزدوری ہے مل گئی۔ مل گئی نہ ملی تو نہ سہی۔  
ٹھیلے والوں کو کیا دیتے ہیں۔

ٹھیلان کا ہی ہے جن کے پاس میں مندر میں رہتا ہوں۔ جو کتا ہوں سب انہیں دے دیتا ہوں۔ ان میں ایک لڑکی ہے جس نے مجھے بہن کا پیار دیا ہے۔ بس وہاں سے پیٹ بھر کر کھانا مل جاتا ہے اور مجھے کچھ چاہیے بھی نہیں۔

اسی وقت کمرے میں کمل داخل ہوتی۔ اس نے چائے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ چائے کا کپ اس نے عظیم کے سامنے میز پر رکھا اور سیبل کو آواز دی سیبل جلدی لاؤ نا!

سیبل تیزی سے کمرے میں داخل ہوتی۔ وہ دو پلیٹیں اٹھاتے ہوئے تھی۔ ایک میں بھنی ہوئی مونگ اور دوسری میں آلو کے چپس تھے۔ دونوں پلیٹیں اس نے عظیم کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

کیسے ہیں بھائی جان!

عظیم مسکرا دیا۔ ٹھیک ہوں۔

سیبل نے دوبارہ اداسی سے کہا۔

بھائی جان! دیکھتے آپ کی ساری قمیض بھٹی ہوئی ہے۔ اسے تبدیل

(۱۴۴)

کیوں نہیں کرتے۔ پہلے تو آپ کبھی ایسا لباس نہ پہنا کرتے تھے۔ عظیم  
اسے پکڑ کر پیادہ کرنے لگا۔

کیا کہہ رہی تھی۔

چھت پر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔

غلام نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ جاؤ پڑھو جا کر۔ سیدل باہر  
نکل گئی۔ مکمل عظیم کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

فرانسس کی حالت یوں ہو رہی تھی۔ جیسے وہ دل ہی دل میں رو  
رہا ہو۔ پھر اس کی آواز یوں سنائی دی جیسے کوئی آبی طوفان بند توڑ نکلا ہو  
اور ساری مخلوق، دنیا اور نام کو بہا لے جانا چاہتا ہو۔ وہ مکمل سے  
مخاطب ہوا۔

مکمل! عظیم کو سو روپے دے دو۔ نئے کپڑے بنالے گا۔ مکمل اٹھ  
کر باہر نکل گئی۔ عظیم نے سخت احتجاج کیا۔ نہیں نہیں۔ میں نہ لونگا۔  
مکمل پھر کمرے میں داخل ہوئی اور دس دس کے نوٹ اس نے فرانسس  
کو تھا دیتے۔ فرانسس نے نوٹ عظیم کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

میری خاطر رکھ لو عظیم۔ ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ عظیم نے نوٹ  
تھام لیے اور عجیب سے ابڑے بھرے، لٹے ہوئے اور ویران انداز  
میں مکمل کی طرف دیکھنے لگا۔ مکمل اٹھی اور باہر چل دی۔ عظیم اسے دیکھتا رہا۔  
وہ اسے یوں لگ رہی تھی جیسے وہ سیال خوشبو بن کر بہہ گئی ہو۔ یا



رات کے پہلے پہر کانورا خواب جو ایک چھنا کے سے ٹوٹ گیا ہو۔  
 تھوڑی دیر تک غلیم فرانسس سے باتیں کرتا رہا پھر اجازت لے کر کھڑا  
 ہو گیا اور دوسرے کمرے میں گیا۔ وہاں کل اکیلی بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی  
 تھی۔ اس نے غلیم کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ بے تعلق ہو کر پڑھتی رہی۔ غلیم  
 خود ہی ایسی آواز میں بولا جو فکر مندی اور توجہ سے بھرپور تھی۔  
 کل! جس راستے پر تم ان دنوں جا رہی ہو۔ اگر تم وہاں سے ٹوٹ آؤ  
 تو میں وعدہ کرتا ہوں میں تم تینوں کے اخراجات پورے کرتا رہوں گا،  
 خواہ مجھے بک ہی کیوں نہ جانا پڑے۔  
 کل نے گھور کر اس کی طرف دیکھا پھر بے نفس و بے غرض ہجے  
 میں کہا۔

حالات کا مارا ہوا وہ شخص جو خود اپنے اخراجات پورے نہ کر سکتا  
 ہو۔ دوسروں کا بوجھ کیسے اٹھائیگا۔  
 کنکریاں مارنے والے انداز میں غلیم نے پوچھا۔  
 تو تم اپنے آپ کو نہ بد لوگی؟  
 ہرگز نہیں۔  
 کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔  
 ہاں۔ مجھے کسی نصیحت کی ضرورت نہیں۔  
 کیا تم وہی کل ہو جو کراچی میں میرے بغیر ایک پل نہ رہ سکتی تھی۔

عظیم نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سو روپیے کے نوٹ جو فرانس  
نے اسے دیئے تھے۔ کل کے منہ پر مارتے ہوئے درندگی میں کہا۔  
تو پھر مجھے اس کل کی تلاش ہے ہیں۔ سے ڈھونڈ کر دم لونا گا۔ تم لاکھ  
بنو لاکھ اپنے آپ کو چھپاؤ ایک روز میں تمہیں اپنے آپ کو بدل لینے  
پر مجبور کروں گا۔ عظیم تیزی سے مڑھا اور باہر نکل گیا۔ کل نے رسالہ  
ایک طرف رکھ دیا اور اپنی بدبختی، بد حالی و رنجیدگی اور اپنی محروم  
کن حالت پر زار زار رونے لگی۔ عظیم جو روٹھ کر چلا گیا تھا۔ اس  
کا اپنا عظیم۔ حالات نے بیشک اسے عظیم کے قابل نہ رہنے دیا تھا۔  
پر وہ اب بھی عظیم سے محبت تو کرتی تھی نا۔ ————— محبت جو ندیوں  
کی روانی اور نور کے دریا کی طرح پرسکون ہے اور کبھی ایک بھگتان  
اور سزا بن کر اذیت دہ بھی ہو جاتی ہے۔



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com



عظیم نے اب مندر آنا کم کر دیا تھا۔ کمل کے سلوک نے اسے تلخ و تاریک اور گریزاں ہستی بنا دیا تھا۔ اب وہ اکثر ہفتہ ہفتہ بھر باہر رہنے لگا۔ کسی بازار کے کونے کھدرے میں وہ اپنا ٹھیلا کھڑا کر لیتا اور رات کو وہیں سو رہتا۔ اس کا کتا بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ گھر آتا اور شاموں یا رفعت کو پیسے دے جاتا اور انہیں مل بھی جاتا۔ اب وہ ہر طرف سے بیگانہ ہوتا جا رہا تھا۔

پورا ہفتہ باہر گزرنے کے بعد ایک روز وہ مندر واپس آیا۔ بوڑھا شامو املتاس تلے بیٹھا نختہ پی رہا تھا۔ عظیم نے رپڑہ کھڑا کیا اور شاموں کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ شاموں بڑی حسرت سے اسے دیر تک

دیکھتا رہا پھر بڑے دکھ سے کہا۔

ہم سے اتنی ہی نفرت ہو گئی ہے جو یہاں اب آتے ہی نہیں۔  
 عظیم نے المٹاس کے خاکستری تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے رد  
 دینے والی آواز میں کہا۔ میں کسی سے کیا نفرت کر دنگا، لوگ ہی مجھ سے  
 نفرت اور بیزاری کا اظہار کرنے لگے ہیں۔ میں چھپتا پھرتا ہوں حالات کی تمام  
 ظریفیوں اور چہرہ دستیوں سے۔ یہ جگت، یہ سنسار، یہ انام یہ دنیا ہی  
 میرے لیے عذاب بن گئی ہے۔ بابا! تم عمر رسیدہ، کہنہ سال اور تجربہ کار  
 ہو۔ بتاؤ میں کیا کروں۔

حقے کی نے ایک طرف کرتے ہوئے شامونے غم آلود آواز سے کہا۔  
 میری کوئی اولاد نہیں میرے بچے! میں تو تجھے ہی اب اپنا بیٹا سمجھتا  
 ہوں۔ پر تمہارے حالات نے مجھے بھی الجھا دیا ہے کہ میں ان کا کوئی حل  
 نہیں سوچ سکتا۔ خدا جو رحیم بھی ہے۔ بھگوان جو رام بھی ہے۔ نہیں صبر اور  
 سکون عطا کرے۔

عظیم بے چہرہ گیا۔ خدا کسی کو کیا دے گا۔ جو غریب کی اے اختتام آ رہا  
 نہیں سن سکتا۔ مظلوم کی موقع پر مدد نہیں کر سکتا۔ کیسا خدا ہے تمہارا جو  
 انصاف تلاش کرنے والوں کو انصاف نہیں دیتا۔ بے گناہوں کو انسان  
 کے بناتے ہوئے قانون کے سامنے بے گناہ ثابت نہیں کر سکتا۔  
 کمرے سے رفعت اور آفتاب نکل کر وہاں آکھڑے ہوئے اور



عظیم کی باتیں سننے لگے۔ عظیم نے پہلے سے بھی سخت لہجے میں کہا۔  
کہاں ہے خدا؟ — خدا ان کا ہے جو کتوں کی طرح غریبوں کا گوشت  
لوپتے پھرتے ہیں۔

عظیم کی حالت مٹو فالوں جیسی ہو گئی۔ خدا ان کا ہے جو ہم محنت کشوں  
کو بھیڑ بکری کی طرح بانکتے ہیں اور بھیڑیے بن کر ہمارا خون پیتے ہیں۔  
میرا تمہارا خدا کہاں ہے بابا!

ہم اس جہاں بھی گنہ گار اور اس جہاں میں مجرم — ہم یہاں بھی  
ذلیل و سوار وہاں بھی رسوا و وسیا، — — — ہم — — — ہم  
ذلیل ہیں کیونکہ، نیچ، بے غیرت۔ بے حیا ہیں — کیونکہ ہم بے مایہ  
ہو ہوتے۔ رفعت اور آفتاب وہاں کھڑے رونے لگے تھے۔ شاموں  
نے، ہم مدھم، چکیوں میں روتے ہوئے کہا۔

شاید آج پھر کسی نے تمہارا دل توڑا ہے؟  
عظیم نے جلتے اور ویران موسم کی سی اداسی سے کہا۔  
تم بھی بھولے ہو بابا! ہم جیسے فرو ماندہ اور مسلے کچلے لوگوں کا بھی  
دل ہوتا ہے؟ — — — ہم پتھر ہیں۔ گرم ہواؤں میں اڑتے ہوئے  
نوک پتے ہیں۔

شاموں کو جیسے کوئی بات یاد آگئی اور سنبھلتا ہوا بولا۔ یہ اوپر کی  
منزل ہیں جو بیمار اور بوڑھا فرانسس رہتا ہے نا۔ جس کے ہاں تم جاتے

رہتے ہو اس کی چھوٹی لڑکی کسی بار تمہیں بلائے آتی رہی ہے کہہ رہی تھی  
ابو بلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور لڑکی بھی کئی بار تمہیں ملنے آتی  
رہی ہے۔

کون لڑکی؟

اس نے اپنا نام عاصفہ بتایا تھا۔

عظیم کا سر جھک گیا۔ شاموں نے پھر پوچھا۔ کیا یہ وہی ہے جو کبھی  
تمہاری منگیتر تھی اور تمہارے چھوٹے بھائی سے شادی کر لی تھی۔  
عظیم کا سر جھکا رہا۔ دکھ سے اس نے کہا۔ ہاں۔

قبل اس کے شاموں کچھ اور پوچھتا۔ رفعت ایک ہاتھ میں تانب چینی  
کی چلمچی اور دوسرے میں پانی کا لوٹا لیکر آگئی۔ اس کی آنکھوں سے ابھی  
تک آنسو بہہ رہے تھے اور وہ اپنے ہونٹ سیکڑ سیکڑ کر ضبط کرنے کی  
تاکام کوشش کر رہی تھی۔ چلمچی عظیم کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے  
ڈوبتی اور لرزتی آواز میں کہا۔

ہاتھ دھولیں بھیا اور کھانا کھائیں۔

وہ عظیم کے ہاتھوں پر پانی ڈالنے لگی۔ عظیم جب ہاتھ دھو رہا تھا۔  
رفعت کی آنکھوں سے کئی آنسو نکل کر چلمچی میں گر گئے۔ عظیم نے بیتاب  
ہو کر پوچھا تم دو رہی ہو منی!

رفعت نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ طوفانوں میں



کانپتی ہوتی کچی اور نوزائیدہ شاخ کی طرح — عظیم پھر بولا۔  
 میں نے اپنی بہن سے کہا پوچھا ہے؟  
 رفعت نے پانی کا لوٹا ایک طرف رکھ دیا اور عظیم سے لپٹ کر دھاریں  
 مار کر روتے ہوئے اس نے کہا۔

بھئی! آپ خدا کے خلاف نہ بولا کریں۔ ایسی مایوسی کی باتیں نہ کیا  
 کریں۔ نہ ہیں تو ایک روز آپ کی بہن مر جاتے گی۔ شاموں نے رفعت کو  
 علیحدہ کیا۔ وہ سنبھلی اور عظیم کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے۔ فرش پر اس  
 نے چٹائی بچھائی اور اس پر کھانا رکھ دیا۔ عظیم کھانا کھانے لگا۔ رفعت نے  
 دو روٹیاں اٹھائیں اور باہر آکر عظیم کے کتے کے آگے ڈال دیں۔

عظیم نے ابھی آدھا کھانا ہی کھایا تھا کہ کمرے میں عاصفہ داخل ہوئی  
 عظیم کو فرش پر بیٹھے کھانا کھاتے دیکھ کر وہ بچھ سی گئی۔ عظیم نے ایک بار  
 نگاہیں اٹھا کر عاصفہ کو دیکھا۔ پھر کھانا کھانے لگا۔ عاصفہ آپ ہی آپ عظیم  
 کے بستر پر جا کر بیٹھ گئی عظیم جب کھانا کھا چکا تو عاصفہ فوراً اٹھی اور اس  
 کے سامنے سے کھانے کے خالی برتن اٹھا کر ایک طرف رکھ دیئے۔ عظیم  
 نے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا پر منہ سے کچھ نہ بولا۔ خاموشی  
 سے وہ اٹھا اور باہر نکلنے لگا۔ عاصفہ اٹھی اور اسے سامنے کھڑی ہوتی  
 ہوئی بولی۔

میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

بڑے صبر سے کام لیتے ہوئے عظیم نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔  
کہو؟

آپ پہلے وہاں بیٹھیں۔ عاصفہ نے بستر کی طرف اشارہ کیا۔ عظیم کا چہرہ یوں ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی ایک دھماکے سے پھٹ پڑے گا۔ تاہم وہ بستر پر بیٹھ گیا۔ عاصفہ اس کے سامنے دوسرے بستر پر بیٹھی اور کانپتی آواز میں کہا۔

میں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔  
عظیم نے کلا صاف کیا — کیسی معافی؟ میں خود گناہ گار ہوں میں  
کسی کو کیا معاف کروں گا۔

گناہ گار تو میں ہوں آپ کی۔  
تم کہنا کیا چاہتی ہو۔  
ننگین اور دلگیر ہو کر عاصفہ بولی۔  
میں آپ کو لینے آئی ہوں۔  
کدھر؟

اپنے ساتھ لے جاؤنگی۔

عظیم جیسے یادوں کے سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ میں یہاں خوش ہوں۔  
میرا تم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں۔ تم اب جاؤ اور آئندہ کبھی ادھر نہ آنا۔  
تم ایک شادی شدہ خاتون ہو۔ اور ایک شادی شدہ عورت کو غیر مردوں



سے یوں ملتے شرم آئی چاہتیے۔ غلطی نے بھرپور طنز کیا تھا۔  
عاصفہ رو پڑی۔

میں قیصر سے طلاق لے لوں گی۔ میں اس کی بیوی نہ رہوں گی۔ میں اس سے طلاق لے لوں گی۔ اس سے شادی میری زندگی کی سب سے بڑی بھول ہے۔ میں شروع ہی سے آپ کو چاہتی تھی لیکن آپ چونکہ امی کی ہر بات آنکھیں بند کر کے مان لیتے تھے اس لیے مجھے گمان ہوا کہ شادی کے بعد میری کوئی وقعت ہوگی۔ لہذا میں نے قیصر سے شادی کر لی۔ لیکن مجھے سکون نہ ملا۔ اب حالات بدل چکے ہیں اور میں آپ کو اس حالت میں مشقت کرتے نہیں دیکھ سکتی۔

غلطی نے ایسی آواز میں کہا جس میں دکھوں کی آہٹ تھی۔ میرے دل کا آگینہ اب ٹوٹ چکا ہے۔ تم — تم اب میرے زخموں کا انداز نہیں ہو سکتی۔ تمہاری موجودگی میرے لیے اشتعال طبع کا باعث بنتی ہے۔ عاصفہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ مندر کی اس کو ٹھٹھی میں سیخ بستہ اور اسی بکھر گئی تھی۔ عاصفہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کے بھیگے موتی تیر رہے تھے۔ جیسے یادوں کی لاش پر بیٹھی ماتم کر رہی ہو۔ کمرے پر سکون تھا۔ صبح کے خاموش اندھیروں کے سکون کی طرح۔ عاصفہ پھر خواب انگیز آواز میں بولی۔

آپ میرے ساتھ چلتے نا۔

عظیم کے چہرے پر قہر کی ہولناکی اور غضب ناک چھا گئی تھی۔ وحشی اور جنگلی قسم کے شفقتی رنگ اس کے چہرے کی ہیبت کو بدل گئے تھے۔ پھر سپاٹ کھنکھتی اور عضیلی آوازیں اس نے کہا۔

مجھے تم سے نفرت ہے۔ میں اب تمہاری شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا دفع ہو جاؤ یہاں سے۔

عاصفہ نے کوئی اثر نہ لیا اور وہیں بیٹھی محبت بھری نگاہوں سے عظیم کو دیکھتی رہی۔

عظیم بل کھاتا ہوا کھڑا ہو گیا اور زور سے چلایا۔ میرے نزدیک تم غلیظ اور گناہ آلود ہو۔ اٹھو اور دفع ہو جاؤ یہاں۔ ورنہ یہیں بیٹھی بیٹھی کاگلا گھونٹ دوں گا۔ عظیم نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔ اٹھو جاؤ۔

عاصفہ دوپڑی اور زور زور سے چلانے لگی۔ میں نہیں جاؤں گی۔ یہیں آپ کے قدموں میں جان دے دوں گی۔ عظیم نے اسے زور کا دھکا دے کر کمرے سے باہر نکال دیا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے وہ دروازے سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

عاصفہ دروازہ پیٹنے لگی اور عظیم دروازے سے پیٹھ لگاتے کھڑا رہا۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پرانی، قدیم اور گم گشتہ یادیں ایک تیز دھار کی طرح اس پر برسے جو بگنی تھیں۔





اپنے کتے کے ساتھ کسی کا سامان چھوڑ کر وہ نیلم سینما سے چوک  
نا خدا کی طرف آنے والی سڑک پر رہڑھا کھینچا چلا جا رہا تھا۔ اس کے  
ٹھیلے کے پیٹے دائیں باتیں جھول کھاتے ہوئے کھڑو کھٹ کر رہے تھے  
چوک پر آکر وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے سے ایک کار آتی تھی جس میں  
ایک جوان مرد کے ساتھ کمل بیٹھی ہوئی تھی۔

عظیم مشکلی باندھے اسے دیکھنے لگا۔ کمل نے اسے دیکھا نہ تھا۔  
ایک دوکان کے سامنے کار رک گئی اور کمل نیچے اتر کر اس مرد کے ساتھ  
اس دوکان میں چلی گئی۔ شاید شاپنگ کرنے لگی تھی۔ اس کا گاہک ہو تھا۔  
عظیم نے ٹھیلے وہیں ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ اور خود ٹھیلے

سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس پر سبحان خیسری طامی ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ  
 زرد اور آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور فضاؤں سے  
 تیرگی تانک جھانک کرنے لگی تھی۔ اس کی سالنوں کی تھکن بڑھ گئی تھی اور  
 جسم سے پسینے پھوٹ نکلے تھے۔

اس کے ذہن میں جھکڑ چل نکلے تھے۔ حالات کی تلخیوں اور وقت کے  
 مظالم کے۔ دل ڈوبنے لگا تھا۔ گویا کوئی اسے زنجیروں میں جھکڑ کر دھو تیں۔  
 گہرے تاریک اور سیام دھوئیں میں دور تک گھسٹتا لے گیا ہو۔ اس نے  
 رہڑے کو یوں مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ جیسے وہ ابھی اسے اٹھا کر پٹخ دیگا۔  
 اس کا جسم ہلکورے کھانے لگا۔ گہرے سمندر میں ڈوبنے والی بے بس و  
 بے مددگار ناؤ کی طرح۔ اس کا کتا رہڑے کے پاس بیٹھ گیا تھا۔

اچانک اسے نہ جانے کیا سوچھی وہ اپنے رہڑے پر کھڑا ہو گیا اور  
 زور زور سے چلا کر چوک میں ادھر ادھر جاتے لوگوں کو اپنی طرف بلانے لگا  
 لوگوں! میری ایک بات سنو!  
 میرے ایک سوال کا جواب دو لوگو!

تھوڑی دیر تک وہ چلا چلا کر لوگوں کو اپنی طرف بلاتا رہا۔ جب کافی  
 تعداد میں لوگ اسکے سامنے جمع ہو گئے تو عظیم نے ہاتھ لہرا کر انہیں خاموش  
 رہنے کو کہا۔ اتنی دیر میں کل بھی اپنے ساتھی کے ساتھ دوکان سے نکل آتی  
 تھی۔ عظیم کو دیکھتے ہی کل بچاری وہیں کھڑی ہو گئی اور حسرت سے اس کی



طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی نے اس کا گلابی گلابی بازو پکڑتے ہوئے کہا۔  
آؤ چلیں

کمل نے اپنا بازو چھڑا لیا اور غمزہ لہجے میں کہا۔  
ٹھہرو! دیکھیں یہ حالات اور وقت کا کچلا ہوا انسان کیا کہتا ہے۔ میں  
اسے برسوں سے جانتی ہوں۔ میری طرح اس کا بھی کوئی خدا نہیں ہے۔  
کمل خاموش ہو گئی۔ عظیم کی آواز باندھ ہوئی تھی۔ لوگو۔ میں ایک  
حقیر، غلیظ اور پلید انسان ہو پر میں تم سب سے ایک سوال کرتا ہوں تباہ  
”خدا کہاں ہے“

مختلف آوازوں میں لوگ چلانے لگے۔  
خدا ہے۔

عظیم نے پھر پوچھا۔ خدا کہاں ہے۔  
لوگ خاموش ہو گئے۔ ایک سفید ریش بزرگ آگے بڑھے اور بڑے  
پیار سے کہا۔ خدا ہر جگہ موجود ہے بیٹے۔ وہ سب کچھ دیکھتا اور ہر بات  
کی خبر رکھنے والا ہے وہ دونوں جہانوں کا خالق و مالک ہے۔  
عظیم گونجتے مگر تلخ لہجے میں بولا۔

لوگو! جو چرواہا اپنے ریوڑ کی صحیح نگہداشت نہیں کر سکتا کیا وہ چرواہا  
کہلا سکتا ہے؟ لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ”نہیں۔ نہیں۔“  
”کشتی کا وہ مالک جو کشتی چلانا ہی نہ جانتا ہو کشتی کا نا خدا کہلا سکتا ہے۔“

لوگ پھر چلائے۔ نہیں۔

غظیم کی آواز بلند، دیوانہ وار اور بے لگام ہو گئی۔

○ وہ حاکم جو اپنی رعایا سے عدل و انصاف نہیں کر سکتا۔ کیا وہ ایک انصاف پسند حکمران کہلا سکتا۔ بڑے لوگوں نے پھر نفی میں جواب دیا۔ دوکان کے سامنے ستون کا سہارا لیکر کھڑی کمل رو دینے والی تھی۔

غظیم پہلے سے بھی زیادہ گونجدار آواز میں بولا۔

تو پھر سنو لوگو! یہ دنیا چل رہی ہے اور چلتی رہے گی۔ کوئی اس کا پیدا کرنے والا نہیں۔ کوئی خدا نہیں ہے۔ یہ دنیا نور و ظلمات کی جنگ کا دوسرا نام ہے۔ یہ دنیا ————— یہ ————— یہ آتش و خون کا قلعہ زخار ہے۔ یہ بہتے لہو کا ایک نگر ہے یہ آب و گل کا ایک ایسا مرکب ہے۔ جو کسی کے ہاتھ کی تخلیق نہیں۔ اگر ————— اگر اس جہاں کا کوئی پیدا کرنے والا ہوتا۔ کوئی اس کا خالق ہوتا۔ کوئی خدا ہوتا جسے اپنی اس تخلیق کے ملیں گے دکھ درد کا احساس ہوتا تو اسے ویرانہ حیات کے فرزندو! اس دنیا میں اس جہاں میں تعصب کے زندان نہ ہوتے۔ جسموں کی گرمی اور سانسوں کی نرمی سے کھیلنے والے نہ ہوتے۔ کلیوں کا اس چوسنے والے بھنورے اور آگنیہ اس اس کو توڑنے والے نہ ہوتے۔ پھر جیسے غظیم کے شعور پر جوالا کھئی اور کوئی آتش دہن پھٹ پڑا۔

اگر خدا ہے۔ اگر وہ اس دنیا کا خالق ہے تو پھر یہاں کیوں بھنورے



کلیوں کا کھیل جاری ہے۔ لوگ جب دوسرے کے آشیانوں کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں۔ تو کیوں خاموش رہتا ہے۔ اس نے اپنے ہونٹ پتھر کیوں لیے ہیں۔ اس نے چپ کی بکل کیوں مار رکھی ہے۔ کیوں اس نے اپنے ہونٹ سی لیے ہیں۔ کل اپنے ساتھی کو نظر انداز کر کے زاد قطار رونے لگی تھی۔

ہونٹوں کو تر کرنے کے لیے اپنی زبان عظیم نے ہونٹوں پر پھیری اور زیادہ بہکتا چلا گیا۔

دل کے پھول یہاں کیوں مسلے جاتے ہیں ؟  
لوگ شعور محبت سے نا آشنا کیوں ہیں ؟  
کیوں — کیوں یہاں انمول اور معصوم بٹیاں لوگوں کے ہاتھوں تنگ آ کر کھلونوں کی طرح سستے داموں اپنی عزت بیچتی پھرتی ہیں  
دشوازیوں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوم کی ہزاروں بچیاں کیوں بک رہی ہیں —

جواب دو لوگو! مجھے جواب دو۔

ماں کی متائیں آنچ اور بہن کے خلوص میں رنگ کیوں نہیں رہا۔  
باپ بے حس اور بھائی بے غیرت کیوں ہو گئے ہیں۔  
اگر خدا ہے۔ اور اس نے اس دنیا کو پیدا کیا ہے تو کیوں اسے اپنی اس تخلیق کا احساس نہیں جو جل رہی ہے۔ کیوں اسے اپنے بندوں

کی رہبری اور ہدایت کا خیال نہیں جو دردوں کی طرح بھیانک اور وحشی  
ہو رہا ہے۔ کوئی خدا نہیں۔ کوئی خدا نہیں ہے لوگو!۔  
کمل دھاڑیں مار کر رونے لگی تھی۔ لوگ شور کر رہے تھے۔  
تم چھوٹے ہو!

تم بکواس کرتے ہو۔ خدا ہے۔ وہ بے نیاز و لاشریک ہے۔  
ایک بزرگ اونچی آواز میں بولے۔ شاید تلخ حالات نے تمہیں کھل  
دیا ہے اور تم بھٹک گئے ہو۔ مگر یاد رکھو خدا ہے۔ اس نے نیکی اور بدی  
کے دو راستے متعین کر دیئے ہیں اور مقررہ وقت تک انسانوں کو ان راستوں پر  
چلنے کی ہدایت عطا کی ہے۔ یہ سوچنا انسان کا اپنا کام ہے کہ بدی کو چھوڑ کر  
نیکی کا راستہ اختیار کرے اس لیے کہ اللہ نے اسے عقل دی ہے۔  
عظیم کچھ بولا۔

یہ جھوٹ ہے۔ خدا نہیں ہے۔

یہاں ماں بک رہی ہے۔ بہن کا سودا ہو رہا ہے  
کسی کی عزت اور کسی کا نشان مٹ رہا ہے

یہاں ————— یہاں ————— عظیم کو خاموش ہونا پڑا۔ لوگ  
اس پر آوازیں لے رہے تھے شور کرنے لگے تھے۔ بانٹ بانٹ کی بولیاں  
کانوں کے پردے اور جیڑنے لگی تھیں۔

یہ وطن دشمن ہے۔ اسلام دشمن ہے۔ دیر یہ ہے۔ کیونٹ ہے





مارو اسے مار دو سالے کو۔ دشمن کا ایجنٹ ہے۔ پڑھا دکھا ہے۔ سی۔  
آئی۔ اسے کا ایجنٹ لگتا ہے۔ غدار ہے مارو اسے۔

دو تین پتھر اس پر آکر گرے۔ پھر بے شمار لوگ سڑک کنارے سے  
پتھر اٹھا اٹھا کر اسے مارنے لگے۔ عظیم خاموش ہو گیا۔ اپنے ٹھیلے  
کے اوپر وہ اس محبسے کی طرح خاموش اور ساکن کھڑا تھا جس کا وقت،  
مقام اور صنایع خاموش ہو گئے ہوں۔ ہاں اس کا کتا پتھر پھینکنے والوں  
کی طرف منہ کر کے بھونک رہا تھا جیسے۔۔۔ جیسے ان سے اپنے  
مالک کے لیے اس کی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو۔

کمل چونک اٹھی اور روتی ہوئی اپنی پوری رفتار سے عظیم کی طرف  
بھاگی۔ ساتھ ہی وہ لوگوں کو مخاطب کر کے چلا چلا کر کہتی جا رہی تھی۔

اسے نہ مار دو گوا۔ یہ مجبور ہے۔ بڑا بے بس انسان ہے۔ حالات  
نے اسے کچل دیا ہے۔ اپنوں نے اسے روندھ دیا ہے۔ یہ ایک ایسا  
مظلوم انسان ہے۔ جو لوگوں کے ظلم تلے دب گیا ہے۔ اسے مت مار دو گوا  
مت مارو اسے! کمل چاہتی تھی کہ وہ آگے بڑھ کر عظیم سے لپٹ کر اسے  
پتھروں کی بوچھاڑ سے بچا لیگی۔

لیکن۔۔۔ لیکن اس کے وہاں پہنچنے سے قبل ہی عظیم  
بے ہوش کر اپنے رہڑے کے اندر گر گیا تھا۔ کمل اس کے پاس آئی،  
اور روتے ہوئے بڑی بے بسی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ ٹھیلے کے

اندھے بے سدھ پڑا تھا اور اس کے دونوں بازو دو خشک ندیوں کی طرح پھیل گئے تھے۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ زخم آئے تھے اور خون بہہ رہا تھا۔ مکمل کو جانے کیا سوچتی وہ رہ پڑے پر چڑھ گئی اور لوگوں کے ہجوم کو منتشر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مخاطب کر کے بولی۔

لو! میں ایک ایسی لڑکی ہوں جو مجبور یوں کے ہاتھوں اپنی عزت بیچتی ہے۔ میں ہر روز بکتی ہوں اور تم ہی لوگ میرے ناموس کی قیمت لگاتے ہو۔ تم ہی لوگوں نے میرا بازو پکڑ کر گناہوں کی اس بھٹی میں دھکیلا تھا۔ مکمل نے اپنے اس ساتھی کی طرف اشارہ کر کے کہا جو ابھی تک اس دوکان کے باہر کھڑا تھا۔

وہ شخص جو کار کے پاس تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ ابھی ابھی اس نے میری عصمت کی قیمت چکانی اور بھٹیوں کی طرح میرے جسم کو بھینچ ڈیا ہے۔ مکمل کا وہ ساتھی کار میں بیٹھ کر بھاگ گیا۔ مکمل پھر چلائی۔

لوگو! میں بھی کسی کی بیٹی ہوں کسی کی عزت ہوں۔ کسی کی بہن ہوں کسی کے گھر کی روشن شمع ہوں۔ جس شخص کو تم لوگوں نے پتھر مار کر بے ہوش کر دیا ہے۔ اسے میں جانتی ہوں۔ میری اور اس کی روح کا ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ لوگو! جو کچھ اس نے کہا ہے سچ ہے۔ اگر خدا ہے تو کیوں اپنی موجودگی کا اظہار نہیں کرتا۔ عورت جس



کے قدموں تلے اس نے جنت رکھی ہے جب لوگ زبردستی اس کی عزت سے کھیلے ہیں تو وہ کیوں انصاف نہیں کرتا۔ خاموش کیوں رہتا ہے۔ گناہی کی دھند میں کیوں کھو جاتا ہے۔ کیوں ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا نہیں دیتا۔ کیوں گنہگاروں سے ان کے گناہ کی قیمت وصول نہیں کرتا۔

میں بھی خدا کو نہیں مانتی۔ میں بھی تم سے کہتی ہوں خدا نہیں ہے۔ مجھے بھی مارو لوگو! اتنے پتھر مارو کہ میں یہیں ختم ہو جاؤں اور گناہوں کی تاریک اور گناؤں کی زندگی سے چھٹکارہ حاصل کر جاؤں۔ اسے مارا ہے تو مجھے بھی مارو لوگو! میں بھی اس کی ہم خیال ہوں میرا بھی کوئی خدا نہیں ہے۔

کمل نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ لوگوں کے سر جھج گئے تھے۔ اور آہستہ آہستہ وہ منتشر ہونے لگے تھے عجیب کچا کچا سا ماحول ہو گیا تھا۔ کمل نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹاتے۔ لوگ جا چکے تھے۔ کمل نے ایک بار غلیم کی طرف دیکھا چہرہ ہڑے سے اتری اور بھاگتی ہوئی ایک نل پر گئی اور اپنی ساڑھی کا پلو پانی میں بھگولائی۔ غلیم کا منہ اس نے اُپر کیا اور پانی کے چھینٹے دیتے۔

غلیم نے آنکھیں کھولیں اور کمل کی طرف دیکھتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر کمل کی طرف پیٹھ کرتے ہوئے اس نے دکھی آواز میں کہا۔  
مرحانے دیا ہوتا مجھے۔

کمل منہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ بچا دی منہ میں ساڑھی کا پلو لیکر رونے لگی۔

عظیم نے پھر اس کے نازک دل پر نشتر چلایا۔

تمہارے یہ آنسو تمہیں بے گناہ ثابت نہیں کر سکتے۔ جاؤ چلی جاؤ۔ تمہارا گاہک کسی دوسرے چوک پر کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔

کل ہچکیاں لیکر رونے لگی۔ عظیم نے غصے میں پھنکار تے ہوتے کہا۔

روتی کیوں ہو؟ ماتم کر رہی ہو اپنی لٹی ہوتی عصمت کا؟ جاؤ ڈوب مرو بوڑھے راوی میں۔ شہر کی گلی گلی اور کوچے کوچے میں کیوں اپنے بوڑھے اور شریف باپ کی عواطف و احوال اور عزت و نجابت بچتی پھر رہی ہو کیوں تم نسوانی شرف و ناموس کو روندھ کر بدنامی کے جھنڈ نصب کر رہی ہو۔

کل اس کے پیچھے بیٹھ گئی اور اپنے جسم کا سارا بوجھ عظیم پر ڈال دیا۔ اس کے انداز میں تفویض، سوا لگی اور سپردگی تھی۔ وہ عظیم سے لپٹ کر کسی غیر آباد اور غیر مستعمل خانگاہ کی طرح اداس بیٹھی رو بہم ہی تھی۔

عظیم کی آواز پھر کہیں دُور سے سنائی دی۔

کتنے پیسے لیے اس گاہک سے کتنے میں بیچا اپنا جسم۔ کیا قیمت لگاتی

تم نے اپنے بوڑھے اور بیمار باپ کی عزت کی۔

ہچکیاں لیتی ہوتی کل اٹھی اور اپنی ساڑھی کے پلو سے عظیم کے زخم صاف کرنا چاہے۔ عظیم تڑپ کر ایک طرف ہو گیا اور غصیلی آواز میں کہا۔

دُور رہو مجھ سے تم۔ تم جہنمی خاں اور ویران کھنڈ رہو۔ خالی سیب

اور پھٹا ہوا بادبان ہو۔ بے حیائی کا جامہ اور کانٹوں پر پڑا پھول ہو۔ دولقمہ



نان کی خاطر تم نے حیوانی طلب اختیار کر لی ہے۔ تم نے اپنا ایمان بگاڑ لیا ہے تم گناہوں میں زندگی بسر کر رہی ہو۔ تم — تم اپنا جسم بچوڑ کر لوگوں سے اپنا حرمت بہا وصول کر رہی ہو۔ جاؤ چلی جاؤ اور اپنے اسی گناہک کے گلے میں باہیں ڈالو جو تمہارے اس گلابی اور حسین جسم کی قیمت ادا کر چکا ہے۔ میں ایک بے بس اور کچلا ہوا انسان ہوں میں تمہارے جسم کی قیمت ادا نہیں کر سکتا۔

کل نے آگے بڑھ کر عظیم کے پاؤں پکڑ لیے۔ چلتے میں آپ کو ہسپتال لے چلتی ہوں۔ عظیم نے اپنے پاؤں چھراتے ہوئے کہا۔ مجھے ہسپتال نہیں قبرستان لے چلو اور گلا گھونٹ کر مجھے وہاں دفن کر دو تاکہ میں تمہیں جگہ جگہ عزت بیچتے نہ دیکھ سکوں۔ کل عظیم کی گود میں گر گئی۔ معاف کر دیجئے میں نے آپ کو بہت دکھ دیئے ہیں۔ پھر اس نے اپنا سر عظیم کی چھاتی پر رکھتے ہوئے کہا۔ چلتے اٹھئے نا۔ ہسپتال چلیں۔

عظیم اسے اپنے آپ سے علیحدہ کر دیا اور پھرتے ہوئے کہا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو۔ کیا تم اس قابل ہو کہ کوئی شریف آدمی تمہارا ہاتھ تھام سکے۔ کیا تم نے اپنے آپ کو اس قابل نہ کیا ہے کہ کوئی مجلا مانس تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنا سکے۔ کل رہڑے میں بیٹھ کر رونے لگی۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور فضاؤں

میں روشنی کی لاش پرتا دیک رات یوں بیٹھ رہی تھی جیسے انسانی لاش پر منحوس  
گدھ کمل کی ہچکیاں اور سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ عظیم دہڑے سے نیچے  
اترا اور مدہم سی دکھتی آواز میں اس نے کمل سے کہا۔

نیچے اترو۔ میں نے جانا ہے۔

کمل ٹھیلے کے اندر لیٹ گئی اور روتی و بین کرتی ہوئی آواز میں کہا مجھے  
کہیں لے چلیے اور اپنے ہاتھوں سے دفن کر آئیے!

عظیم نے کچھ سوچا پھر اپنا ہڑہ کھینچنے لگا۔ جب گھر داخل ہوا تو عمارت  
کے بیرونی دروازے کے قریب ہی کمل دہڑے سے اتر کر اپنے گھر چلی  
گئی۔ عظیم نے املتا سے تیلے ٹھیلہ کھڑا کر دیا۔ اور اندر جانے کے بجائے دہڑے  
کے پیٹے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مندر کی کوٹھڑی سے شاموں، رفعت اور  
آفتاب کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کا کتابھی دم ہلاتا ہوا اس  
کے پاؤں کے قریب آ کر بیٹھ گیا تھا۔

کافی دیر تک وہ وہیں بیٹھا رہا اور آنکھیں بند کیے رکھیں۔ شاید اونگھ  
گیا تھا بکا رہا۔ پھر کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ اس نے جب آنکھیں  
کھولیں تو شاموں کھڑا تھا عظیم جب دوبارہ آنکھیں بند کرنے لگا تو شاموں نے  
پدرانہ شفقت سے پوچھا۔

کس وقت آتے ہو بیٹے!

عظیم نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔



پھر اندر کیوں نہ آئے۔

غظیم خاموش رہا۔ شاموں نے پھر پوچھا۔

آج کچھ اداس بھی زیادہ ہو؟

اثبات میں سر ہلاتے ہوتے دُکھ سے غظیم نے کہا۔

آج میں بہت پریشان ہوں بابا!

شامو طوفانوں میں ٹمٹماتے چراغ کی طرح بجھ گیا۔ کیوں میرے بیٹے!  
دل ٹوٹ گیا ہے۔

کوئی اپنا آدمی مل گیا ہوگا۔

ہاں بابا!

کون ملا؟

وہی ساتھی جس کی مجھے تلاش تھی۔

کمل؟

ہاں

کہاں ملی تھی۔

سر باز اور اپنی عزت بیچتے اور اپنے جسم کا نیلام کرتے ہوتے۔ غظیم چند  
لمحے خاموش رہا پھر دُکھتی آواز میں کہا۔

وہ ایسا زہر پیئے کی عادی ہو گئی ہے جس کا کوئی تریاق نہیں۔

شاموں کی آواز دُکھ اور غم سے زنگ آکر ہو گئی تھی۔ یہ نفس بڑا بے دید

اور پلید ہے میرے بیٹے۔ انسان کے ضمیر میں یہ نہ جانے کیا کیا کرنے کی خواہش پیدا کرتا رہتا ہے۔ صبر سے کام لو بیٹے! وقت ہی زنجیروں کا بہترین مرہم ہے۔ غلام نے بڑے تکلیف دہ احساس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

میرا تو جیون ہی مجھ سے روٹھ گیا ہے بابا! پریت کے نلٹے ٹوٹ رہے ہیں۔ دشواریوں کی زنجیریں بڑی طرح مجھے جکڑ رہی ہیں۔ یاس و ناامیدی کے سیاہ ناگ میری طرف اپنے زہریلے پھن اٹھانے لگے ہیں۔ اب تو زندگی سزا بن گئی۔ تنہا اور تپتے درخت کی طرح۔

شاموں نے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

بڑے نصیبوں سے کیا شکوہ بیٹے۔ اسے اپنی تقدیر کے حروفِ ارقام سمجھ کر قبول کر لو۔

غلام ا۔ پنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

میں گھٹنے نہ ٹیکو لگا بابا! جب تک جسم میں روح ہے میں ایسے حالات کا مقابلہ کرتا رہوں گا۔  
شاموں پھر بولا۔

تم آج پانچ روز بعد آتے ہو بیٹے! اس دوران تقریباً ہر روز تمہارے چچا سادات اور ان کی لڑکی آسیہ تمہیں لینے آتے رہے ہیں۔ وہ دونوں سخت پریشان تھے۔ وہ تمہیں بازاروں میں بھی تلاش کرتے رہے ہیں لیکن تم انہیں نہ ملے۔  
شاموں کہتے کہتے رک گیا۔ کمرے کے اندر سے



رفت کی آواز سنائی دی۔

کہاں بیٹھ گئے ہو بابا !

شاموں نے نیچی سی آواز میں کہا۔

عظیم آیا ہے بیٹی !

رفت دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلی اور دروازہ اس نے کھلا ہی

رہنے دیا۔ رفت عظیم کی طرف بھاگی۔ کمرے میں جلتے ہوئے بلب کی روشنی اب

کھلے دروازے میں سے عظیم پر پڑ رہی تھی۔ تو وہ خوف سے کانپ گئی

عظیم بڑی طرح زخمی تھا۔ اس کی قمیض جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی اور سارے پکڑوں

پر خون کے دبھے تھے۔ رفت گرتے گرتے بچی اور دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ہاتے میں مر گئی۔

شاموں نے فکر مندی سے پوچھا۔ کیا ہوا بیٹی۔

رفت نے روتے ہوئے کہا۔

آپ نے مجھ کی حالت دیکھی ہے بابا ! یا آنکھیں بند کر کے اس کے

پاس بیٹھے ہیں۔ شاموں نے عظیم کو خون آلود دیکھ کر چونکتے ہوئے پوچھا۔

کس نے تمہیں مارا ہے بیٹے !

انگنتی انگنتی سی آواز میں عظیم نے جواب دیا۔

اس دنیا والوں نے جو دل تو رکھتے ہیں پر دل کے نہاں خانوں میں انسانیت

کی محبت اور ہمدردی کا جذبہ نہیں رکھتے۔ رفت زور زور سے رونے لگی تھی

شاموں کے بھی آنسو بہہ نکلے تھے۔ کمرے کے اندر سے آفتاب بھاگتا ہوا آیا۔  
اور پریشانی سے پوچھا۔

تم لوگ رو کیوں رہے ہو بابا !  
شاموں نے روتے روتے کہا۔

عظیم کی طرف دیکھو بیٹے ! کسی نے اسے مار مار کر لہو لہاں کر دیا ہے۔ اسے  
کچھ ہو گیا تو میں مرجاؤنگا بیٹے۔ شاموں نے اپنا سراپنہ دونوں گھٹنوں میں  
چھپایا اور بچوں کی طرح سک سک کر رونے لگا۔

رفعت سنبھلی۔ عظیم کا بازو پکڑ کر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ چلتے بھیتا  
اندر چلیں سب اٹھ کر اندر آتے۔ رفعت نے بڑے پیار سے پوچھا۔  
کس سے جھگڑا ہوا ہے بھیتا !

زہر علی آواز میں عظیم نے جواب دیا۔  
تمہارے خدا کی ایسی مخلوق سے جو حیوانیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔  
شاموں نے تڑپ کر پوچھا۔

کیا تمہارا خدا نہیں ؟  
میرا کوئی خدا نہیں ہے۔  
میرے چند سوالوں کا جواب دو۔

پوچھو۔



پھولوں کی نازک پتیوں میں رنگ و خوشبو کون بھرتا ہے؟  
 رات کو آسمان پر ستاروں کے کاروان کون روشن کرتا ہے  
 کون ہے جو ہر روز بلا ناغہ سورج کو مشرق سے ہی طلوع کرتا ہے۔ مقررہ  
 وقت پر ایک منٹ آگے نہ پیچھے۔ وہ کون سی ہستی ہے جس نے چاند اور  
 سورج کے راستے اور منزلیں مقرر کر رکھی ہیں کہ سورج کبھی خط استوا، کبھی خط  
 جدی اور سرطان پر سفر کرتا ہے؟ گرمی کے بعد سردی اور خزاں کے بعد بہار  
 کون لاتا ہے؟

یہ لہریں لیتے ہوئے سمندر، بہ فضاؤں کی وسعتیں اور حدِ نگاہ تک پھیلا  
 ہوا نیلا آکاش۔ ان سب کے پیچھے کسی کا ہاتھ ہے کوئی انہیں کنٹرول کرتا ہے۔  
 تم ایک مشین ہی کو لو۔ ہر مشین کا ہر پرچہ اور آلے کا کوئی نہ کوئی موجد اور  
 صنّاع ہوتا ہے تو کیا تم سمجھتے ہی یہ کروڑوں میلوں میں پھیلی ہوئی کائنات  
 جو ایک مشین ہی کی طرح ہے اس کا کوئی صنّاع اور موجد نہیں۔ ضرور ہے۔  
 اور وہی خدا ہے۔

عظیم خاموش رہا کوئی جواب نہ دیا۔ یوں لگتا تھا وہ شاموں کی باتوں  
 سے متاثر ہوا ہو۔ شاموں نے ایک چرکا لگایا۔  
 میں جانتا ہوں تمہارے بُرے سے بُرے حالات نے تمہیں خدا کے خلاف بولنے  
 پر مجبور کر رکھا ہے۔ ورنہ مجھے یقین ہے تمہارا ضمیر اور تمہارا دل اس بات کو تسلیم  
 کرتے ہیں کہ خدا ہے۔

عظیم نے بے پروائی سے کہا۔  
ہوگا مجھے بھوک لگی ہے کھانا دو۔  
رفت نے آفتاب سے کہا۔

آفتاب! بھیتا کو کو ساتھ لے جاؤ اور ان کے ہاتھ دھلا کر لاؤ۔ بھیتا کھانا  
کھالیں۔ پھر انہیں ڈاکٹر کے پاس لیجاؤ اور پیٹیاں کرا لاؤ۔ آفتاب عظیم کا ہاتھ  
پکڑ کر غسل خانے نل کی طرف لے گیا۔

رفت نے ڈوبتی ہوئی آواز میں شاموں سے کہا۔

بھیتا کو حالات نے گمراہ کر دیا ہے۔ اس کا کوئی چارہ ہونا چاہیے بابا!۔  
میں بھی اپنی طرف سے کوشش کرونگی کہ بھیتا کو اور بھٹکنے نہ دیا جاتے۔  
شاموں نے سوچتے ہوئے کہا۔

میں اپنے محلے کی مسجد کے خطیب سے بات کرونگا۔ کسی روز جمعہ کے  
روز عظیم کو گھر روک لیں گے۔ اور انہیں کہیں گے کہ وہ ایسا خطبہ دیں جس سے  
خدا کا وجود ثابت ہو۔  
ہاں بابا یہ ٹھیک ہے۔

عظیم منہ ہاتھ دھو آیا۔ رفت نے پہلے اس کے پکڑے تبدیل کراتے  
پھر اسے کھانا دیا اور وہ کھانے لگا۔





رات آٹھ بجے کل اپنے گھر جانے کے لیے عمارت کی سیڑھیاں چڑھنا ہی چاہتی تھی کہ سیڑھیوں کی اوٹ سے ایک جوان سامر نکلا اور کل کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ نہجثو تھا جو اسی عمارت میں رہتا تھا اور جو اکھیل کر گزر بسر کرتا تھا غصے کی حالت میں کل نے اسے پیچھے ہٹانا چاہا لیکن اس نے کل کا بازو پکڑ لیا۔ اور انچوں لہنگوں کے ہجے میں کہا۔

میری ایک بات سنتی جاؤ۔

ایک جھٹکے سے کل نے اپنا بازو چھڑا لیا۔ کہو۔

مجھے پتہ چل گیا ہے تم باہر ٹیوشن پڑھانے نہیں اپنی عزت نیچنے جاتی ہو۔ کل نے کوئی جواب نہ دیا اور ایک طرف سے ہو کر سیڑھیاں چڑھنے

کی کوشش کی مگر بخشو نے آگے ہو کر راستہ روک لیا اور غصے میں کہا۔  
 میری پوری بات سن کر جاؤ ورنہ پھٹاؤ گی۔  
 مکمل خاموش رہی۔ بخشو نے جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور مکمل کی  
 طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

بولو کیا قیمت لگاتی ہوا اپنے اس حسین جسم کی  
 مکمل نے غصے میں اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا۔ بکو اس نہ کرو۔  
 بخشو نے طنزاً کہا۔ ناراض کیوں ہوتی ہو۔ دوکاندار کو سودا بیچنے سے  
 غرض ہوتی ہے۔ گاہک کے اچھا بُرا ہونے میں وہ کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔  
 مکمل نے بیزاری سے کہا۔ مجھے جانے دو۔

بخشو ڈھیٹ ہو گیا۔ نہیں جانے دیتا۔ بلا لوجے بلانا ہے۔ اس عمارت  
 میں اگر تمہارا کوئی حمایتی ہے تو اسے آواز دے لو۔ دیکھتا ہوں کون میرے سامنے  
 آنے کی جرات کرتا ہے۔ آج رات ہر حالت میں تمہیں میرے کمرے میں چلنا  
 ہو گا بخشو نے ذرا جھک کر جب مکمل کو اٹھانا چاہا۔ تو مکمل نے بڑی تیزی کے  
 ساتھ اپنی پوری طاقت سے بخشو کو دھکا دے کر دُور گرا دیا اور پھر بڑی تیزی  
 سے بیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی گئی۔

فرانسس کے کمرے میں جا کر وہ بیٹھ گئی۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا فروٹ کا  
 لفافہ اور اپنا پرس تپائی پر رکھے اور فرانسس کے سر ہانے بیٹھی ہوئی سیبل  
 سے کہا۔



کھانا تیار ہے بے بی!

ہاں باجی

تم نے کھا لیا ہے۔

نہیں۔ آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔

جاؤ پھر یہیں لے آؤ۔ میں ابو کے لیے فروٹ لگاتی ہوں اور یہیں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ سیبل باہر نکل گئی تو فرانسس نے مکمل سے کہا۔

جلدی آجایا کرو بیٹی! میں تمہاری طرف سے پڑا پریشان رہتا ہوں۔

مکمل نے بے پروائی سے کہا۔ بس دیر ہو جاتی ہے۔ ابو۔ ٹوشنیں جو زیادہ ہو گئی ہیں۔

غلیم سے کہیں ملاقات ہوئی؟

جی نہیں

فرانسس نے بڑی آس سے کہا۔

نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ پچھلے کئی روز سے میں سیبل کو لگاتار مندر بھیجتا ہوں۔ لیکن وہ کہتے ہیں غلیم پچھلے کئی روز سے یہاں آ ہی نہیں رہا۔ میرا دل اس سے اداس ہو گیا ہے۔ اب کی بار آیا تو میں اس سے شادی کی بات کر دوں گا۔ میں اسے کہوں گا میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ مکمل تمہاری امانت ہے اسے اپنے ساتھ لے جاؤ جہاں مرضی رکھو۔ اپنے گھر چاہے مندر۔ اگر وہ یہیں ہمارے ساتھ ہے پر آمادہ ہو گیا تو اود بہتر ہو گا۔ میری بیٹی! تمہاری غلیم

سے شادی ہو گئی تو میں سکون سے مر سکوں گا۔

کمل کچھ کہنے والی تھی کہ بخشو کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے سیبل تھی۔ وہ سخت پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی۔ کمرے میں آکر بخشو نے ایک غلط اور غلیظ نگاہ کمل پر ڈالی اور فرانسس کو مخاطب کر کے کہا۔

انکل ! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ؟  
کمل پیلی پڑ گئی اور خوف سے اس کا جسم کپکپانے لگا۔ فرانسس نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بیٹھو ! اور کہو کیا کہنا ہے۔

کمل سیبل کا بازو پکڑ کر اٹھی کمرے سے دونوں بہنیں نکلیں اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر بخشو کی گفتگو سننے لگیں۔ فرانسس کی آواز سنائی دی۔ کیا کہنا ہے۔

بخشو نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

تم جانتے ہو تمہاری بیٹی کمل کیا دھندہ کرتی ہے جس سے وہ گھر کے اخراجات چلا رہی ہے۔

ٹیوشن پڑھاتی ہے بیکاری  
بخشو نے غصے میں کہا۔

یہ جھوٹ ہے وہ عزت بیچتی ہے۔

فرانسس نے اپنی پوری آواز سے چلاتے ہوئے کہا۔



بخشو بلا سوچے سمجھے میری بیٹی کو اتنا بڑا الزام نہ دو۔

میں اس کا ثبوت مہیا کر سکتا ہوں۔ اپنی بیٹی سے قسم دیکر پوچھو کیا وہ ایک اینگلو انڈین عورت کی وساطت سے طوائف کا دھندہ نہیں کرتی۔ وہ عورت جو تمہاری طرح کر سچیں ہے۔ بھاری بھاری رقموں کے عوض تمہاری بیٹی کے لیے گاہک تلاش کرتی ہے۔

بخشونے زور دے کر کہا۔

خدا کی قسم تمہاری بیٹی عزت بیچتی ہے۔ وہ ایک چلتی پھرتی طوائف ہے جو بھاری رقموں کے عوض اپنا جسم بڑے لوگوں کے ہاتھوں بیچتی ہے۔ میری بالکل یقین کرو نہ کرو تمہاری مرضی پر ایک بات ضرور ذہن میں بٹھا کر رکھنا اس عمارت میں شریف لوگ رہتے ہیں اور وہ یہ بات کبھی برداشت نہ کریں گے کہ ایک سلجھی ہوئی پڑھی لکھی لڑکی کے روپ میں یہاں اس عمارت میں عزت فروش، ادب باش، قمامہ اور طوائف پیشہ لڑکی رہے۔

بخشو اٹھ کر باہر نکل گیا۔ اور بیڑیوں کے پاس کھڑے ہو کر وہ اپنی لگائی ہوئی آگ کا رد عمل دیکھنے کا انتظار کرنے لگا۔ فرانسس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ غصے میں وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا اور آنکھیں پتھر اسی گئی تھیں تب ایک دم ہی اس کی آواز گونجی۔

کمل! کمل! یہاں میرے پاس آؤ۔

کمل سر تھکاتے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے سیبل بھی تھی۔

کی طرح چلتی ہوتی مکمل فرانسس کے پاس آتی اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ فرش کو گھورے جا رہی تھی۔ فرانسس نے غصے میں اسے گھورتے ہوئے کہا۔  
بخشوں نے جو الزام تمہیں دیا ہے وہ سنا تم نے؟

مکمل نے مجرموں کے انداز میں کہا۔ ہاں ابو!

کیا انہوں نے سچ کہا۔ جھوٹ بولنا تمہیں باپ کی عزت اور بائبل کی قسم! مکمل خاموش رہی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ فرانسس کی تلخی اور بڑھ گئی۔ میں تمہارے منہ سے کچھ سنا چاہتا ہوں۔

مکمل کا جسم کانپ رہا تھا۔ جیسے تیر طوفانوں میں درخت جھوم رہے ہوں پھر اس کی پھٹی پھٹی سی لرزتی آواز سنائی دی۔

یہ سچ ہے ابو!

فرانسس زور سے دھاڑا

لیکن ایسا کیوں ہوا؟

مکمل کھل کر ہچکیوں میں روتے ہوئے بولی۔ یہ سب کچھ چند مجبوریوں کے تحت ہوا ہے ابو!

فرانسس چار پائی سے اٹھا اور پھر لگا تار کٹی طمانچے اس نے مکمل کے منہ پر دے مارے۔ کوئی مجبوری نہ تھی۔ اس سے تو بہتر تھا ہم بھوکوں مر جاتے۔ بے شرم تم عظیم جیسے سحرے انسان کو اب کیا منہ دکھاؤ گی۔ مکمل بچا رہی لرز کر فرش پر گر گئی۔ اور فرانسس غصے میں اسے پاؤں کی ٹھوکریں



مارنے لگا۔ کل روتے روتے ماد کھا رہی تھی۔ قریب ہی کھڑی سیبل زور زور سے رونے لگی تھی۔

ایکدم فرانسس کو کچھ ہوا وہ اپنا ہاتھ اپنے دل پر لے گیا اور ڈگمگانے لگا پھر دھم سے فرش پر گر گیا۔ کل تڑپ کر اٹھی اور اپنے باپ کو سنبھالنے لگی۔ لیکن اب وہاں کیا دکھاتا تھا۔ فرانسس کی حرکت قلب بند ہو چکی تھی اور وہ مر گیا تھا۔ سیڑھیوں پر کھڑا نچو بھاگ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔ دونوں بہنیں باپ کی لاش سے پیٹ کر رونے لگی تھیں۔ کل زور زور سے ہن کرتی ہوتی رو رہی تھی۔

ابو ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلتے۔ کیوں ہمیں تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپ کے بعد اس دنیا میں ہمارا کون ہے۔ کون ہمارے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھیگا۔ کوئی نہیں۔ ابو کوئی نہیں۔ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلتے۔ ہمارا تو خدا بھی نہیں ہے۔

عمارت کی کافی عورتیں وہاں جمع ہو گئی تھیں اور دونوں بہنوں کو تسلی دینے لگی تھیں۔ کچھ لوگوں نے ددی کا انتظام کر کے نیچے بچھا دی تھی اور افسوس کرنے والے مرد وہاں آکر بیٹھنے لگے تھے۔ دونوں بہنیں ساری رات باپ کی لاش سے پیٹ پیٹ کر روتی رہیں۔ دوسرے روز عمارت والوں نے مل کر فرانسس کا کفن و فن کر دیا۔

باپ کی قبر سے جب دونوں بہنیں واپس آئیں اور سیڑھیاں چڑھ کر

اپنے گھر جانے لگیں تو مکمل نے دیکھا۔ عمارت کے احاطے میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ عورتیں کھڑکیوں اور بالکونیوں میں کھڑی تھیں اور بخشوا احاطے میں جمع مردوں کو زور زور سے کہہ رہا تھا۔

محلے والو! عزت دارو

ماؤں بہنوں والو! بہو بیٹیوں والو!

مرحوم کی لڑکی جس کا نام محمل ہے۔ عزت بیچتی ہے اور یہ بات ہم سب کے لیے بدنامی اور خطرے کا باعث ہے یہاں سب کی جوان بیٹیاں ہیں خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ ایک پھلی پورے جل کو گندہ کرتی ہے۔ آنے والے اس وقت کا خیال کرو جب بدنامی کی یہ سیاہی دوسروں کے منہ پر بھی لگ جائے گی۔ بدی کی یہ کالک کئی اور کا بھی منہ لتھڑے گی۔  
بخشوا اور زور سے چلایا۔

یہ عمارت کی دوسری لڑکیوں کو بھی خراب کرے گی۔ یہاں گندگی پھیلانے گی۔ بد معاش لوگ اس عمارت کو فحاشی کا اڈہ سمجھ کر اس کے گرد چکر لگانا شروع کر دیں گے۔ اس طرح کسی بھی بہو بیٹی کی عزت محفوظ نہ رہے گی۔ اگر آنے والے اس سیاہ وقت سے بچنا چاہتے ہو تو میری مانو۔ اسے یہاں سے نکال دو۔ کہیں اور چلی جاتے۔

لوگ طرح طرح کے فیصلے سنانے لگے۔

ہاں ہاں اسے یہاں سے نکال دو۔



سب کی عزتیں ہیں یہاں گند پڑ جائیگا۔

اسے کہہ کہیں اور چلی جائے۔ اس عمارت میں نہیں رہ سکتی۔

اچانک بوڑھا شامو اپنی بیساکھیاں ٹیکتا ہوا ہجوم سے نکلا اور لوگوں کو مخاطب کر کے بولا۔

لوگو! یہ ظلم ہے۔ اس کا باپ مر گیا ہے۔ یہ ایک بے بس لڑکی ہے۔ تم لوگوں نے اگر اسے یہاں سے نکال دیا تو یہ بچاری اور زیادہ گناہوں کی عادی ہو جائے گی ہمیں چاہیے اسے سہارا دیں۔ اس نے جو کچھ کیا ہے مجبور یوں کے تحت کیا ہے۔ میں اس سے بات کر چکا ہوں۔ وہ ایک باعزت اور شریف باپ کی لڑکی ہے۔ وہ ضرور سنبھل جائے گی۔ یہاں سے نکل کر وہ خبر نہیں کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔ میٹرھیوں پر کھڑی کل سب کچھ سن رہی تھی اور روہی تھی۔ کھڑکیوں اور بالکونیوں میں جمع ہونے والی عورتیں اونچی اونچی آوازوں میں تبادلہ خیال کر رہی تھیں۔

بچاری بے آسرا ہے اسے یہاں سے نکالنا ظلم ہے۔

چہ چہ بچہ بچاری کہاں جائے گی۔ کہاں سر چھپا سکی

ایک بوڑھی عورت نے غصے میں چلا کر کہا۔

شامو ٹھیک کہتا ہے۔ اسے مت نکالو یہاں سے۔ پڑا رہنے دو۔ تم اگر اس کی مدد نہیں کر سکتے تو یتیموں پر ظلم کیوں کرتے ہو۔ خدا کے خوف سے ڈرو۔ کل نے سیبل کا ہاتھ پکڑ لیا اور دونوں نہیں اُپر چلی گئیں۔ بجشوں نے پھر بکنا شروع کیا۔

میں اس عمارت سے گندگی نکالنا چاہتا ہوں اور تم لوگ اپنے ہاتھوں سے گندگی پھیلانا چاہتے ہو۔ اگر اسے یہاں رکھا گیا تو میں پولیس کو اطلاع کروں گا اور بتا دوں گا۔ یہ لڑکی پیشہ کراتی ہے۔

شاموں نے چلا کر کہا۔

تم ظالم ہو۔ وہ سب کی بیٹی ہے۔ اسے اس وقت سہارے کی ضرورت ہے۔  
بخشو کسی غلیظ اور خارش زدہ کتے کی طرح بھونکا۔

اس کی مظلومیت کا اتنا ہی خیال ہے تو اپنے گھر لے جاؤ۔ تمہارے پاس بھی ایک ہٹا کٹا لڑکا رہتا ہے جسے تم نے اپنا بیٹا بنا رکھا ہے۔ اسے اس سے بیاہ دو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بوبو کیا اس گندگی کو تم اپنے ہاں سمیٹتے ہو۔

شاموں نے اپنی بوڑھی چھاتی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ میرے عظیم کو آ لینے دو۔ میں اسے اس سے شادی پر رضامند کر لوں گا۔ بخشو کی شہ پر عمارت کے زیادہ تر مرد شور کرنے لگے۔

وہ یہاں نہیں رہیں گی۔

اگر وہ نہ گئی تو ہم دھکے دیکر نکال دیں گے۔

اتنے میں سیڑھیوں پر کھل اور سیبل نمودار ہوئیں۔ کمل نے لرزتی آواز میں کہا۔

لوگو! میری خاطر جھگڑا نہ کرو۔ میں خود ہی یہاں سے جا رہی ہوں۔

کمل سیبل کے ساتھ اپنا مختصر سا سامان اٹھاتے عمارت سے نکل گئی۔ لوگ

اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بوڑھا شاموں اپنی بیساکھیاں ٹیکتا ہوا مندرستی طرف چلا گیا تھا۔





شب کے تاریک و سیام حلقے پھیل رہے تھے۔ آسمان پر گھنگھو گھٹائیں  
 ورنندوں کی طرح دھاڑ رہی تھیں۔ اودھے اودھے سے بادلوں کے ٹکڑے  
 ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے۔ شفق میں ڈوبے بادلوں کے  
 ٹکڑے فطرت کے اسرار کی پردہ کشائی کر رہے تھے۔ فضاؤں میں۔ ہواؤں میں  
 نیچر کے حسین اور بے آواز نغمے بکھر گئے تھے۔ عظیم آج کئی روز بعد مندر لوٹ رہا  
 تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنا ٹھیلہ کیچ رہا تھا اور اس کا کتا ٹھیلے کے اندر لیٹا  
 ہوا تھا۔

جب وہ سرکلر روڈ پر آیا تو پیچھے سے کسی نے اسے آواز دی۔  
 عظیم بھتیجا!

وہ رک گیا اور مڑ کر پیچھے دیکھا۔ قیصر آ رہا تھا۔ غلیم کے پاس آ کر وہ رک گیا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور حالت فقیروں جیسی ہو رہی تھی۔ غلیم چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ وہ قریب آیا اور دونی سی آواز میں کہا۔

بھائی جان! خدا کے لیے آپ یہ کام چھوڑ کر گھر چلیں۔ میں برباد ہو چکا ہوں۔ عاصفہ نے مجھ سے علیحدہ ہو کر کہیں اور رہائش اختیار کر لی ہے اور اب وہ مجھ سے طلاق کا مطالبہ کر رہی ہے۔

سو کھے روکھے ہجے میں غلیم نے پوچھا۔

تو میں کیا کروں؟

قیصر نے منت کی۔ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں بھائی جان! وہ پھر آپ سے محبت کرنے لگی ہے۔ اور آپ ہی کی خاطر وہ مجھ سے طلاق کا مطالبہ کر رہی ہے۔ میں خالہ کے پاس بھی گیا تھا۔ اس نے کہا ہے یہ تم دونوں کا معاملہ ہے۔ انکل نے بھی بہت سمجھایا لیکن وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

غلیم نے بیزاری سے کہا۔ مجھے تم دونوں سے نفرت ہے۔ وہ میرے پاس آئی تھی۔ میں نے اسے دھکے دیکر نکال دیا تھا۔ جاؤ ڈھونڈتے پھر واسے۔ قیصر نے آگے بڑھ کر اس کا ٹھیلہ پکڑ لیا۔

میں آپ کو یہ کام نہ کرنے دوں گا۔

غلیم کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو گیا۔ خصوصیت کے کئی رنگ اس کے چہرے پر بکھر گئے۔ ایک بھر پور طمانچہ اس نے قیصر کے منہ پر مار دیا۔



استحقار سے اس نے کہا۔

نیچ کیلئے اتم مجھ سے میرا یہ آخری سہارا بھی چھیننا چاہتے ہو جس سے میں اپنے پیٹ کا دودھ بھرتا ہوں۔ تم نے پہلے ہی مجھے ریشہ خطنی سے نکال کر غم اور شفاوت میں پھینکا۔ اپنی مسرت کی جستجو میں تم میری ذہنی تباہی کا باعث بنے۔ اب پھر تم مجھے اسی بھٹیاری خانے اور نیلام گھر لیجانا چاہتے ہو جہاں میں پہلے ہی ایک بار ایک چکا ہوں۔ جاؤ چلے جاؤ میرا تم سے کوئی نااطہ نہیں ہے۔ اب تم پر مصیبت پڑی ہے تو میں بھائی بن گیا ہوں۔ پہلے تم کہاں تھے۔ قیصر خوفزدہ ہو کر تیجھے ہٹ گیا اور غلام رہ کر کھینچتا ہوا تارکی میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

وہ گھر داخل ہوا۔ ٹھیلہ اٹاس تلے کھڑا کر کے وہ کمرے میں داخل ہوا اندر انگلیٹی ہیں آگ جل رہی تھی جس کے گرد شامو رفعت اور آفتاب بیٹھے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک موندھے پر عاصفہ بیٹھی ہوتی تھی۔ غلام کو دیکھتے ہی شاموں نے حقہ ایک طرف ہٹا دیا اور پدرانہ شفقت میں کہا۔  
شکر ہے میرا بیٹا گھر تو لوٹا ہے۔

رفعت نے روٹھنے کے انداز میں پوچھا۔

بھائی جان! ہم سے اتنی ہی نفرت ہو گئی جو کئی کئی روز آپ ملتے ہی نہیں۔ غلام نے عاصفہ کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ رفعت کی طرف دیکھتے ہوئے وہ ہلکا سا مسکرایا اور جیب سے کئی مڑھے مڑھے نوٹ نکال کر رفعت

کو تھما دیتے۔

یہ سنبھالو! اور کھانا دو سخت بھوک لگی ہے۔ تم لوگوں نے کھانا کھایا کیا؟  
 نہیں بھئی! ہم تو ہر روز آپ کا انتظار کرتے ہیں۔ جب مایوس ہو جاتے کہ آپ  
 نہیں آئیگے پھر جا کر کھانا کھاتے ہیں۔ رفعت کھانا لگانے لگی تھی کہ شاموں بول پڑا۔  
 وہ اوپر والا بوڑھا تو تمہیں یاد کرتے کرتے ہی مر گیا۔ روز اپنی چھوٹی بچی کو  
 تمہیں بلانے بھیجا کرتا تھا۔

چونک کر عظیم نے پوچھا۔ کون بوڑھا۔  
 وہی فرانسس جس کے ہاں تم اکثر جاتے رہتے تھے۔  
 عظیم کی آواز جیسے گلے میں پھنس گئی تھی۔ فرانسس مر گیا،  
 ہاں مر گیا بچا رہ

اور اس کی دونوں لڑکیاں؟  
 انہیں بخشو نے یہاں سے بدنام کر کے نکلوا دیا ہے۔  
 کون بخشو؟

وہی بد معاش جو نیچے کی منزل میں رہتا ہے اور جو اکیلے رہتا ہے۔  
 اس نے کیوں نکالا؟

اس نے شور کرنا شروع کر دیا تھا کہ بڑی لڑکی عزت بیچتی ہے۔ اس نے  
 کہاں تھا میں اس انیگلو انڈین عورت کو بھی جانتا ہوں جو اس کے لیے گاہک  
 مہیا کرتی ہے بخشو نے بھی اس کی عزت سے کھیلنا چاہا پر اس لڑکی نے انکار کر



دیا۔ جس پر بخشو نے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا سنا ہے وہ بچادی عزت بیچ کر گھر کے اخراجات کے علاوہ اپنے بیمار باپ کا علاج بھی کر رہی تھی۔

اس کے باپ کو اس کا علم انہیں تھا۔ وہ یہی سمجھتا تھا کہ اس کی بیٹی ٹیوشن پڑھانے جاتی ہے۔ اسے جب پتہ چلا کہ اس کی بیٹی عزت بیچتی ہے تو وہ اس صدمے سے دم توڑ گیا۔ محلے والوں نے مل کر اس کا جنازہ کیا۔ اور دونوں لڑکیوں کو یہاں سے نکال دیا۔ میں نے بہت روکا۔ عمارت کے لوگ بھی شاید مان جاتے پر بخشو نے سارا کام خراب کیا۔ اس نے ہی لوگوں کو ہوا دی اسے نکال دو ورنہ پورا محلہ خراب ہو جاتے گا۔

اب خبر نہیں بچادی دونوں بہنیں کہاں دھکے کھا رہی ہونگی۔ بڑے ظالم لوگ ہیں یہ نہیں سوچتے چلو اس سے اگر گناہ ہو ہی گیا تو اس کی مدد کر کے اس کی اصلاح کر دی جاتے یہ ہودوں نے اسے یہاں سے نکال ہی دیا تاکہ گناہوں کی دھسان اور دلدل میں اور زیادہ پھنس جائے۔ واہ رام! کیسا جگت ہے یہ۔ کیا زمانہ آگیا ہے۔

غصے میں کانپتی آواز میں غلیم نے پوچھا  
بخشو کہاں ہے؟

یہیں ہے۔ تھوڑی دیر قبل ہی کہیں سے لوٹا ہے۔ جوا کھیل کر ہی آیا ہوگا۔ ذرا اٹھ کر مجھے اس کا کمرہ دکھاؤ۔ میں اس سے بات کرونگا۔ شاموں نے غلیم کے اظہار دیکھتے ہوئے کہا۔

چھوڑا اب مٹی ڈالو اس معاملے پر بیٹھو کھانا کھاؤ۔

مجھ پر اس وقت تک کھانا حرام جب تک بخشو سے بات نہ کر لوں۔ شاموں نے اپنی بیساکھیاں سنبھالیں اور غلیم کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا۔ عاصفہ، رفعت اور آفتاب بھی ان دونوں کے پیچھے پیچھے تھے۔ ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے شاموں نے کہا وہ ہے بخشو کا کمرہ۔

غلیم آگے بڑھا۔ پاؤں کی ایک سخت ٹھوکر مار کر اس نے دروازہ کھولا۔ اندر بھیانک چہرے والا بخشو بیٹھا نوٹ گن رہا تھا۔ جو اجیت کر آیا ہوگا۔ غلیم غصے میں گر جا۔

باہر آؤ بخشو۔

اس نے جلدی جلدی نوٹ سنبھالے اور کھڑا ہو گیا۔

کیا بات ہے ؟

باہر آؤ پھرتا ہوں۔

بخشو باہر آیا۔ غلیم اسے پکڑ کر شاموں کے پاس لایا۔

یہی بخشو ہے بابا !

یہی ہے بیٹے۔

عاصفہ، رفعت اور آفتاب بڑی پریشانی سے غلیم کی طرف دیکھ رہے تھے۔

غلیم نے بخشو کا گریبان پکڑتے ہوئے پوچھا۔

تم نے کل کو یہاں سے کیوں نکالا ؟



بخشوں نے بھی عظیم کا گریبان پکڑ لیا اور بازاری انداز میں دھمکی دی۔  
دیکھو مہاشے! میرے ساتھ بد معاشی نہ کرنا۔ ورنہ یہیں کھڑے کھڑے ایسا  
تاثیر مل گا کہ اپنا ٹھیلہ کھینچنا بھول جاؤ گے۔

عظیم نے ایک زوردار دھکے سے بخشوں کو اپنی طرف کھینچا۔

گندی نالی کے ذیل کھڑے! تم آج تک حرام کھاتے رہے ہو۔ اور میں  
مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتا رہا ہوں۔ آج دیکھنا میرے جیسے محنت کش کے خون  
میں اخلاقی جرأت اور حرارت زیادہ ہے یا تم جیسے حرام خور کے خون میں۔

اس کے ساتھ ہی عظیم نے پوری قوت سے ایک مکہ بخشوں کے جبرٹے پر دے  
مارا۔ مگر اس قدر سختی سے پڑا تھا کہ بخشوں دُور جا گرا۔ جہاں مکہ لگا تھا۔ وہاں گہری  
رگڑ آئی تھی اور خون بہہ نکلا تھا۔ بخشوں اٹھ کر تیزی سے عظیم کی طرف بڑھا۔ لیکن عظیم پر  
تو اس وقت۔ دشمنی، عداوت اور خصومت کا شیطان کا شیطان سوار ہو چکا تھا۔

بخشوں اٹھ کر عظیم کی طرف بڑھا اور عظیم کو لات مارنا چاہی۔ پر عظیم نے اس کی  
لات ہی پکڑ لی اور دوبارہ ایک گھونسا بخشوں کے پیٹ میں مارا۔ پھر جیسے مکوں کا  
طوفان چل نکلا۔ عظیم دیوانہ وار اس پر ادولوں کے طوفان کی طرح برس پڑا تھا اور  
وہ آدم اور توتر کے ساتھ اس پر کے برسائے لگا تھا۔ عداوت کے سب لوگ وہاں  
جمع ہو گئے۔ عظیم نے بخشوں کو مار مار کر گرایا اور اس پر سوار ہو کر وہ کسی زخمی درندے  
کی طرح دھاڑا۔

بتاؤ تم نے آج تک کتنی لڑکیوں کی عزت لوٹی ہے۔

بخشو خاموش رہا — عظیم نے ایک اور مکہ اس کے منہ پر ڈے مارا۔  
بتا دو۔ ورنہ جان سے مار دو لگا۔

دھیمی آواز میں بخشونے کہا۔ لوٹی ہے۔

عظیم کا چہرہ خشونت میں شفق ہو گیا۔

کتنی لڑکیوں کی؟

بخشو پھر رک گیا۔

عظیم نے پھر اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ بتاتے ہو یا لگاؤ ایک اور ہاتھ اور اونچی  
آواز میں بولتا کہ سب لوگ سن سکیں۔  
کافی لڑکیوں کی عزت میں نے لوٹی ہے۔

عظیم نے بخشو کو چھوڑ دیا اور محلے والوں سے مخاطب ہوا۔

لوگو! اس لڑکی نے اپنی عزت بیچی تو تم لوگوں نے اسے دھکے دیکر یہاں  
سے نکال دیا اور یہ ذلیل کتا جو کئی معصوم لڑکیوں کی عزت ٹوٹ چکا اسے تم لوگوں  
نے سینے سے لگا رکھا ہے۔ کیا دونوں ایک جیسے گناہ گار نہیں ہیں۔ جیسا اسی لڑکی  
نے گناہ کیا ایسا ہی اس ذلیل نے بھی کیا۔ اس نے مجبوریوں کے تحت کیا اور  
اس نے جنسی بھوک کے تحت۔

دونوں ایک جیسے مجرم ہیں۔ پھر لڑکی تمہارے عتاب کا نشانہ کیوں بنی اس  
لیے کہ وہ عورت تھی، کمزور، ناتواں اور بے سہارا تھی۔ یہی نا — اسے  
تم لوگوں نے طوائف اور رنڈی کہہ کر پکارا ہو گا۔ اگر عزت بیچنے سے عورت کا نام



بدل جاتا ہے تو مرد جو اس کے ساتھ برابر کا اس گناہ میں شریک ہوتا ہے۔ اسے  
مرد کیوں کہتے ہو۔ اسے بھی طوائف اور دزدی جیسا کوئی نام دو۔  
اس لڑکی کو ذلیل کر کے یہاں سے کیوں نکلا گیا ؟  
کیا وہ انسان نہ تھی۔

کیا وہ کسی کی سچی نہ تھی۔

محلے والو! میں تم سے پوچھتا ہوں۔ تم میں کون ایسا ہے جس نے اپنی زندگی  
میں کوئی گناہ نہیں کیا۔ اس جگت میں، اس سنسار میں اور اس انام میں سب  
ہی گناہ گار اور خطا دار ہیں۔ لوگو! کیا تم میں سے کسی کے ہاں جو ان لڑکی نہیں؟  
سب لوگ خاموشی سے سنتے رہے۔ عظیم کی آواز بلند ہوتی چلی گئی اسے  
یہاں سے نکالتے وقت تم لوگوں نے یہ تو سوچا ہوتا۔ یہاں سے نکل کر وہ کہاں  
جاتے گی۔ ہم سب مل کر اس کی مدد کرتے تو یقیناً وہ عزت بیچتا ترک کر دیتی اس  
نے سب کچھ چند مجبوریوں کے تحت کیا ہے۔ اسے یہاں سے نکال کر تم لوگوں نے  
اسے مجبور کر دیا ہے کہ وہ گناہوں کے غار میں اور آگے چلی جاتے۔

لوگو! سنگدل اور بے رحم لوگو!

تم سب گناہ گار ہو۔

مجرم و خطا دار ہو۔

میں چلا چلا کر کہوں گا۔ تم لوگ ظالم ہو۔ اسے نکالا ہے تو اس بے غیرت کو  
بھی یہاں سے نکالو۔ تم میں کوئی ایسا شخص ہے جو اتنی اخلاقی جرات رکھتا ہو کہ

اسے یہاں سے نکالنے کی آواز بلند کرے۔

کئی جوان ایک ساتھ چلا اٹھے۔

اے، یہاں سے نکال دو۔ یہ اس لڑکی سے بھی زیادہ گناہ گار ہے۔ یہ یہاں نہیں رہ سکتا۔ کئی جوان آگے بڑھے۔ بخشو کو اٹھا اور دھکے دیکر عمارت سے نکال باہر کیا۔ غلیم واپس مڑھا اس نے دیکھا بوڑھا شاموں اپنی بیساکھیوں کے سہارے سر جھکاتے کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جب غلیم اس کے قریب کیا تو شاموں نے اپنا سر اُپر اٹھاتے ہوئے غلیم سے پوچھا۔

تم نے بخشو سے کہا تھا۔ تم نے کل کو کیوں نکالا۔ کیا اس لڑکی کا نام کل ہے۔ غلیم نے پھٹے پھٹے سے حلقوم میں کہا۔

ہاں بابا!

کیا یہ وہی لڑکی ہے جس کی تمہیں تلاش تھی۔

وہی ہے بابا!

پھر تم اسے اپنے ہاں کیوں نہ لے آئے۔

غلیم کی گردن جھک گئی۔ بابا! میرے اور اس کے درمیان کچھ فاصلے حائل

تھے اور میں انہیں سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ لڑکی میری زندگی کا محور ہے

بابا! میں اسے کراچی سے جانتا ہوں۔ وہ ایسی نہ تھی۔ حالات نے اسے کھل

دیا ہے اور وہ ایسی ہو گئی ہے۔ ان — ان ظالم مردوں نے اسے اپنا آپ



بیچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

شاموں اور غلیم کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں رفعت کے ساتھ عاصفہ بیٹھی ہوتی تھی۔ غلیم نے کھولتی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے تمہیں منع نہ کیا تھا؟ پھر تم یہاں کیوں آئی ہو؟  
عاصفہ اس کے پاس اکھڑی ہوئی۔ میں آپ کو لینے آئی ہوں۔  
دکھ سے غلیم نے کہا۔

وہ غلیم مرچکا ہے جو کبھی تم سے محبت کرتا تھا۔  
جو تمہارا منگیترو منسوب تھا۔

جو تمہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز جانتا تھا۔  
عرصہ ہوا وہ بچا رہا تو مرچکا ہے۔ اب تمہارے سامنے دوسرا غلیم کھڑا ہے۔  
اور یہ — یہ تم سے نفرت کرتا ہے۔

نفرت؟

جس کی کوئی انتہاء، قہر اور حد نہیں۔ ایسی نفرت جسے تم پوری زندگی،  
محبت میں نہ بدل سکو گے۔ جاؤ چلی جاؤ۔ کیا — کیا تم وہی نہیں  
ہو جس نے غلیم کو گھر سے جاکر کراچی دھکے کھانے پر مجبور کیا۔ تم نے میری  
ماں اور بہنوں کو موت کے منہ میں دھکیلا — تم نے مجھے ذہنی طور پر مفلوج  
کر دیا۔ پھر تم اپنے کن احسانات کی بنیاد پر مجھے لینے آئی ہو؟

عاصفہ آگے بڑھی اور غلیم کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا میں آج آپ

کو لیے بغیر نہ جاؤنگی۔

عظیم نے فوراً اپنے ہاتھ چھڑا لیے اور لگا تار کٹی طمانچے اس نے عاصفہ کے منہ پر دے مارے۔

ذلیل، کمینہ، نیچ۔ چلی جا یہاں سے۔ تو اب میرے کام کی نہیں۔  
عاصفہ فرش پر گر کر رونے لگی۔ عظیم وہی کھڑے کھڑے خلاؤں میں گھورتے ہوئے بڑبڑایا۔

میں اب کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔

مجھے اس کی جستجو ہے۔

میں اسے تلاش کرونگا۔

وہ میری منزل ہے میں اسے بدل کر رہوں گا۔

میں اسے ڈھونڈوں گا۔ وہ ایک نگینہ ہے جسے لوگوں نے عام پتھروں میں تول کر نظر انداز کر دیا ہے۔

میری خاطر وہ اپنے آپ کو ضرور ڈلیگی۔

میں جانتا ہوں وہ مجھے چاہتی ہے۔

حالات نے اُسے اس قدر جھکایا ہے کہ وہ مردوں سے نفرت کرنے لگی

ہے مگر کب تک؟ ایک روز — ایک روز وہ ضرور اپنے آپ

کو بدلیگی۔ ایک روز وہ ضرور میرے پاس آئے گی۔ وہ میرا موتی میں اس کی سیپ

ہوں۔ میرا اس کا ایسے ہی ساتھ ہے۔ جیسے ستاروں اور کہکشاں کا، سندر کی



انگریزائیاں لے کر اٹھتی ہوتی مہیب لہروں کا اپنے مرکز کے ساتھ۔ میری اس کی چاہت ایسے ہی ہے جیسے سید اور اس کے موتی کی۔ جیسے شبنم اور پھول کی میرا اور اس کا ایک تعلق ہے جیسے جسم اور روح کا، کھیت اور کھلیان کا، ناؤ اور پانی کا، چاند اور ستاروں، اور صبح و شام کا۔ اس نے زندگی میں پہلے ہی بہت ٹھوکریں کھاتی اب میں اسے اور زیادہ بھٹکنے نہ دوں گا میں اسے گلی گلی کو چے کو چے تلاش کروں گا۔

عاصفہ کھڑی ہو گئی۔ اس کے نازک چہرے پر غلیم کی انگلی کے نشان ابھی تک واضح تھے۔ عاصفہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ بس بڑی رحم طلب نگاہوں سے وہ غلیم کی طرف دیکھنے لگی۔ غلیم کا سر جھک گیا اور ہلکے سے اس نے کہا۔ مجھے افسوس ہے آج میرا ماتم پڑا ٹھ گیا ہے۔ میں پہلے ہی گناہ گار ہوں۔ تمہارا دوزخ کا یہاں آنا۔ مجھے بدنام کر دے گا۔ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔ میں خود ایک مسافر، ایک بھکاری اور خستہ حال انسان ہوں میں کسی کو کیا دوں گا۔ جاؤ چلی جاؤ یہاں سے اور پھر کبھی ادھر نہ آنا۔ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں اور مجھے اس کی تلاش ہے۔

عاصفہ سر جھکاتے باہر نکل گئی۔ اس کی حالت اس پھول جیسی تھی جو کانٹوں میں الجھ کر چھدر چھدر ہو گیا ہو۔



کمل کے پاس صرف ایک اٹیچی تھا جس میں دونوں بہنوں کے کپڑے اور  
 ہتھوڑا سا اثاثہ تھا۔ سیبل کی اس نے انگلی پکڑ رکھی تھی اور دونوں بہنیں سڑک  
 کے فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھیں۔ پہلے اس نے اپنی اس اینگلو انڈین دلالہ  
 ڈور تھی کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ پھر پتہ نہیں کیا سوچ کر اس نے اپنا  
 فیصلہ بدل لیا تھا۔

دونوں بہنیں پیدل چل رہی تھیں۔ تارکول کی سڑک ختم ہونے پر نہ  
 آہٹ ہی تھی۔ سورج غروب ہو گیا تھا اور فضاؤں میں لمحہ بہ لمحہ بکھرتی ہوئی  
 تارکی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ سامنے ایک چوک آگیا تھا۔ کمل نے نگاہ اٹھا کر  
 چوک کے پس منظر میں دیکھا۔ دیلوے اسٹیشن آگیا تھا۔ وہ ویلنگ روم میں



بجلی گئی۔ شاید رات وہیں بسر کرنے کا ارادہ تھا۔  
 بچاری کیا کرتی۔ مجبور رہی تھی۔ اٹیچی کا تکیہ بنا کر اس نے سیبل کو ٹا دیا اور  
 خود اس کے پاس بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کچھ سوچا۔ سیبل کا سر ایک  
 طرف کر کے اس نے اٹیچی کھولا اور کمائی اور ایک بڑا چاقو نکال کر اس نے اپنے  
 لباس کے اندر چھپا لیا۔ باہر آسمان پر بادل گرج رہے تھے۔ اور بجلی کی چمک  
 بار بار روشن لکیریں بنا رہی تھیں۔ سردی کا زور بڑھ گیا تھا۔  
 رات دس بجے کے قریب جبکہ دم بھی جاگ رہی تھی۔ ایک جوان مرد  
 اندر آیا اور بڑی ہمدردی سے پوچھا۔

کس گاڑی کا انتظار کر رہی ہو بہن !  
 لفظ بہن پر مکمل چونکی۔ کیونکہ کسی مرد نے آج تک اسے بہن کہہ کر نہ  
 پکارا تھا۔ تاہم وہ خاموش رہی اور کوئی جواب نہ دیا۔

اس مرنے پر پوچھا کہاں جاؤ گی بہن !  
 زخمی آواز میں مکمل نے جواب دیا۔  
 مسافر ہوں۔ یہاں رات بسر کر دوں گی۔

تمہارا گھر کہاں ہے ؟

مکمل مد پڑی۔ میرا کوئی گھر اور ٹھکانہ نہیں۔ میں بے آسرا اور بے سہارا ہوں  
 اس مرد نے بڑی ہمدردی سے کہا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے جیسی کئی  
 لڑکیاں ہمارے ملک میں دھکے کھاتی پھرتی ہیں۔ تم اٹھو میرے ساتھ میرے

گھر چلو۔ میری کوئی بہن نہیں۔ سمجھوں گا۔ مجھے دو بہنیں مل گئی ہیں۔  
 کل خاموش رہی۔ بچا دی کوٹھکانے کی ضرورت تو تھی ہی۔  
 وہ پھر لولا۔

پچکچاؤ نہیں۔ چلو میرے ساتھ۔ میں مقدور بھر تمہاری مدد کروں گا۔  
 کل کھڑی ہو گئی۔ اور سیبل کو جگانے لگی۔ اس مرد نے پھر پوچھا۔  
 یہ سچی تمہاری کیا ہے۔

میری بہن ہے۔

کل نے اٹھی اٹھایا۔ سیبل کی انگلی پکڑی اور اس کے ساتھ ہوئی۔ دس منٹ  
 تک وہ چلتے رہے پھر ایک مکان میں داخل ہوئے وہ کوئی ریلوے کوارڈر تھا۔  
 ایک کمرے میں ان دونوں کو اس نے بٹھایا اور ہمدردی سے پوچھا۔  
 کھانا کھاؤ گی نا؟

کل تکلف برت گئی۔ حالانکہ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔  
 کھانا ہم نے شام کو کھایا تھا۔ مہربانی۔ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے  
 خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔ کیا تم اکیلے ہی رہتے ہو؟

نہیں میری بیوی بھی میرے ساتھ رہتی ہے۔ دو ایک روز کے لیے  
 میکے گئی ہوتی ہے۔ تم دونوں بہنیں اٹھو اور ساتھ والے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ کل  
 اٹھی۔ اٹھی لیا۔ سیبل کا ہاتھ پکڑا اور ساتھ والے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہاں دو  
 چارپایوں پر بستر لگے تھے۔ پر وہ دونوں بہن ایک ہی بستر پر گھس گئیں۔ سردی سے



ٹھٹھری ہوتی جو تھیں۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد کوئی ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ سیدل گہری نیند سوچکی تھی۔ تاہم کل جاگ رہی تھی اس نے زمانے کا فراز و نشیب دیکھا تھا اس لیے احتیاط برت رہی تھی۔ کل نے دیکھا وہی بے غیرت مرد تھا جو اسے بہن بنا کر گھرایا تھا۔ کمرے میں آکر اس نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگالی اور کل کے بستر کی طرف بڑھا۔

کل اٹھ کر بیٹھ گئی اور ہمت کر کے پوچھا۔

تم رات کے اس وقت یہاں کیوں آتے ہو اور دروازے کو کنڈی کیوں لگاتی ہے۔

اس نے بے غیرتوں کے انداز میں کہا۔

یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ؟

کل کھڑی ہو گئی اور زخمی لہجے میں پوچھا۔

تم نے مجھے بہن کہا تھا ؟

اس سے کیا ہوتا ہے۔ مطلب نکالنے کیلئے گدھے کو بھی باپ کہنا پڑتا ہے

میں نے تمہیں بہن کہہ دیا تو کوئی پہاڑ تھوڑا ہی گر گیا ہے۔

کیا آجکل کے بھائی اپنی بہنوں سے ایسا ہی سلوک کرتے ہیں ؟

اس شور کی اولاد نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا۔ کیسا بھائی۔ کیسی بہن ؟ یہ تو

ایک کھیل ہے جس میں میں جیتا اور تم ہار گئی ہو۔

یہ تمہارا وہم ہے۔ ہار جیت کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔ میرے نزدیک آتے  
تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔  
وہ کھوتے کا پتر پھر بے شرمی سے ہنسا۔ ایسے موقع پر ہر عورت یہی دھمکی  
دیتی ہے۔ شور کرنے کی کوشش کی تو گلا گھونٹ کر ابدی نیند سلا دوں گا۔ وہ  
آگے بڑھا۔

دیکھتا ہوں تم کیسے اپنی حفاظت کرتی ہو؟  
کل نے چاقو نکال کر کھولا۔ رات کے سناٹے اور سردی کی ہولناکی میں کمافی اور  
چاقو کے کھلنے کی آواز ایک پرخطر تاثر دے گئی تھی۔  
آؤ آگے۔ اب ہار جیت کا فیصلہ ہوگا۔

وہ خوفزدہ ہو گیا۔ اور دروازے کی طرف لپکا۔ کل جب ذرا آگے بڑھی  
تو وہ زنجیر کھول کر باہر بھاگ گیا۔ کل نے سیبل کو جگایا۔ اپنا اٹیچی لیا اور وہاں سے  
نکل کھڑی ہوئی۔

باہر اب موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ سرما کی تیز اور کاٹ کھانے والی  
ہوا کے تھپیڑے جسم کو چھیڑوں کی طرح ادھیڑ رہے تھے۔ دونوں بہنیں بھیگتی ہوئی  
ایک طرف بڑھتی رہیں۔

بارش اور سردی میں ہر چیز دیران اور سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔ ایسا محسوس  
ہوتا تھا وہ کسی شہر میں نہیں کسی جنگل میں سفر کر رہی ہوں اور ہوا کی آوازیں یوں  
لگ رہی تھیں جیسے ان کے گرد بھوک اور خبیث روحیں چنچ چلا رہی ہوں سیبل



نے ٹھٹھری اور کانپتی آواز میں پوچھا۔

ہم اب کہاں جائیں گے باجی !

کمل روپڑی اور سیبل کو کوئی جواب نہ دے سکی۔

سیبل نے مغموم آواز میں پوچھا۔

تم روکتی کیوں ہو باجی !

کمل بچاری بھری بیٹھی تھی۔ طوفان کی طرح پھٹ پڑی۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے

بے بی ! کوئی کسی کا سہارا نہیں۔ ہر کوئی اپنا مطلب نکالتا ہے۔

سیبل نے پھر پوچھا۔

غظیم بھائی جان کے پاس کیوں نہیں چلتی ہو باجی !

کمل اور زیادہ رو دی۔ وہ بھی ہم سے ناراض ہیں بے بی !

سیبل تھوڑی دیر تک خاموشی سے کمل کے ساتھ چلتی رہی۔ اسے سخت

سردی محسوس ہو رہی تھی اور اس کے دانت بکنے لگے تھے۔ مجبوراً اس نے

کمل سے کہا۔

کہاں جاؤ گی باجی ! مجھے سردی لگ رہی ہے۔ کھانا بھی نہیں کھایا بھوک بھی

لگی ہے۔ کہیں کسی دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔

وہ ابھی تک ریلوے کوارٹرز کے اندر ہی جا رہی تھیں۔ کمل نے شفقت

سے سیبل کو چمتے ہوئے کہا۔ تھوڑا سا اور چلو۔ پھر کہیں مناسب جگہ دیکھ کر

رکتی ہیں۔ آہستہ آہستہ رات کی گہری گفیت تاریکی میں دونوں بے بس و بے آسرا

بہنیں پھر آگے بڑھنے لگیں۔

ایک کوارٹر کے چھجے تلے دونوں بہنیں کھڑی ہو گئیں۔ اس کوارٹر میں بجلی جل رہی تھی اور کوئی بوڑھا مرد اور عورت آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مکمل نے ان کی بات چیت سے اندازہ لگایا تھا کہ ان کے کوارٹر کی چھت ٹپک رہی ہے اور وہ چھت تلے جگہ جگہ برتن رکھ رہے ہیں۔ سیبل نے پھر کہا۔

باجی سردی لگ رہی ہے۔

مکمل نے اسے سیلنے سے لگایا۔

ٹھہرو میں تمہارے کپڑے بدل دیتی ہوں۔

نیچے جھک کر جونہی مکمل اٹھی کھولنے لگی۔ اس کوارٹر کے دروازے کا پٹ

کھلا اور ایک بوڑھے نے باہر جھانکتے ہوئے مکمل سے پوچھا۔

تم کون لوگ ہو؟ اور اس سردی اور بارش میں تم دونوں نے کہاں جانا ہے۔

مکمل نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کھڑی ہوئی اور اس بوڑھے کو دیکھنے لگی۔ بوڑھے

نے دیکھا۔ دونوں بہنیں سردی میں کانپ رہی تھیں اس نے دوبارہ بڑی ہمدردی

سے کہا۔

اس بارش اور سردی میں کہاں جاؤ گی بیٹی !

مکمل کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور وہ تنہا ہوئے اس نے جواب دیا۔

مسافر ہوں اور منزل سے بے خبر ہوں۔

اس دوران ایک بوڑھی عورت جو شاید اس مرد کی بیوی ہوگی۔ دروازے



کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ بوڑھے نے پھر بڑی شفقت سے کہا۔

مسافر تو یہ ساری دنیا ہی ہے بیٹی۔ پر تم جاؤ گی کہا۔

روتے روتے کل نے کہا۔

مجھے کسی کی تلاش ہے بابا!

بوڑھے نے حیرت کا اظہار کیا۔

تلاش؟ — اور اس نامیک گہری رات میں۔ کیسے تلاش کرتی پھر رہی ہو؟  
خدا کو

بوڑھے کا لہجہ متعجب تھا۔ خدا کو؟

ہاں مجھے اس خدا کی تلاش ہے۔ جس نے عورت کو اس قدر ناتواں، کمزور اور

مظلوم پیدا کیا ہے۔ میں اس دنیا کے مکینوں سے پوچھتی ہوں۔ خدا کہاں ہے؟ کہاں  
ہے وہ خدا جس نے اس ظالم منسار کو پیدا کر کے چپ سا دھلی ہے۔ پر میرے سوال کا  
کوئی جواب نہیں آیا اور میں تھک چکی ہوں۔

اس بار وہ بوڑھی عورت بولی۔

خدا تو ہر جگہ ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ اس نے تو عورت کے حقوق

کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ پر اس دنیا نے ہی عورت کو مظلوم بنا دیا ہے۔

کمل نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ تم بھی ٹھیک کہتی ہو ماں! عورت اذل

سے مظلوم اور اب تک مظلوم ہی رہیگی۔

بڑھیا نے کمل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ماں کہہ رہی ہو تو پھر اندر آ جاؤ۔ باہر کھڑی روکیوں رہی ہو۔  
 بوڑھے نے بھی اس کی ہمت بندھائی۔

حالات کی ستائی لگتی ہو۔ اندر آ جاؤ۔ اسے اپنی ماں اور مجھے اپنا باپ سمجھو  
 اس گھر کو اپنا گھر جانو آ جاؤ اندر۔ اندر آ جاؤ بیٹی! یہ میری بیوی سیداں ہے اور  
 میرا نام سرور ہے۔ میں ریلوے میں قلی ہوں۔ ہماری کوئی اولاد نہیں۔ سمجھو نگا وہ  
 پلی پلائی بیٹیاں مل گئی ہیں۔

دونوں بہنیں اپنا اپنی اٹھاتے اندر داخل ہوئیں۔ سیداں نے پہلے دونوں  
 کے کپڑے تبدیل کر کے پھر انہیں بستر میں بٹھا کر ایک بھاری رضائی اوڑھادی  
 سیداں ان کے پاس آئی اور ماں کی سی محبت میں پوچھا۔  
 تم دونوں نے کھانا بھی نہ کھایا ہوگا۔

سیبل نے بڑی معصومیت سے کمر کی طرف دیکھا۔ کیونکہ اسے سخت ہنسنے کا  
 لگ رہا تھا۔ سیبل نے بھی سیبل کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں دونوں  
 بہنوں کے درمیان کچھ طے پایا پھر کمر نے نفی میں سر ہلادیا۔

سیداں کھڑی ہو گئی۔ میں ابھی کھانا لاتا ہوں۔ سیداں نے فوراً چوہا گرم  
 کر کے کھانا تیار کیا۔ دونوں بہنوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا پھر دونوں میاں بیوی  
 ان کے پاس آ بیٹھے اور سرور نے کمر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

اب کہو بیٹی! اس زمانے میں تم پر کیا گزری ہے  
 چند لمحوں تک کمر جھکاتے سوچتی رہی۔ پھر شروع سے لیکر اس نے اپنی



کہانی کہہ دی۔ اپنی عزت بیچنے کی تار یک کہانی کو وہ بیچ میں سے نکالی گئی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی اس کی کہانی سے سخت متاثر ہوئے تھے۔  
 بوڑھے سرور نے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

اصل شیطان بچارہ تو خواہ مخواہ ہی بدنام ہے۔ ہم انسانوں میں اس بھی بڑے بڑے شیطان ہیں۔ وہ تو صرف ایک سجدہ نہ کرنے کا گناہ گار ہے۔ لیکن یہ انسانی روپ والے شیطان ایسے ایسے گناہ کرتے ہیں کہ اصل شیطان بھی کان پکڑتا ہوگا۔  
 کمل اور سیبل وہاں اپنے آپ کو اب محفوظ تصور کر رہی تھیں۔ سرور اور سیداں اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بہنیں گہری اور پرسکون نیند سو رہی تھیں۔



شاہ عالم اور موچی گیٹ کے درمیان عظیم اپنا ٹھیلہ کھینچتا ہوا جا رہا تھا۔ اس کے پیڑھے پربے بے لہجے کے سریلے لہے ہوئے اور پھر شاہ عالم اور موچی گیٹ کی شرک کے اندر سفید مسجدوں کے درمیان چڑھاتی بھی ہے۔ لہذا اس کا پورا زور لگ رہا تھا اور وہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

ایک دم اس نے اپنا ٹھیلہ روک لیا ایک کار بالکل اس کے سامنے آکر رکی تھی۔ عظیم اپنا آپ چرانے لگا تھا۔ کار میں سے سعادت اور آسیہ اترے اور عظیم کار راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ عظیم نے اپنی غم آلود پیشانی پونچھتے ہوئے سعادت کو سلام کیا۔ سعادت آگے بڑھے اور اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔



بیٹے! مجھے اُمید نہ تھی تم اپنی حالت یہ بنا لو گے۔

غظیم کا سر جھک گیا۔ جو ہونا تھا ہو گیا انکل!

مجھے بتاتے اور ملے بغیر ہی میرے بیٹے تم گھر سے بھاگ گئے۔

حالات ہی ایسے تھے۔ میرا وہاں سے نکل جانا ہی بہتر تھا۔

تمہیں ملنے کئی بار میں اور اسی تمہارے مندر گئے۔ پر تم وہاں ہمیں ملتے ہی نہ رہے آج اتفاقاً ہی سرِ راہ مل گئے ہو۔ بیٹے! میں نے تو سوچا تھا اسی سے تمہاری شادی کر دوں گا۔ اور تم ایک باعزت اور پرسکون زندگی کی ابتدا کرو گے۔ پر تم نے مجھے بالواس کیا ہے۔

غظیم نے بڑے دُکھ سے کہا۔

آپ نے میری ماں بہنوں کے بعد جو میرے ساتھ سلوک کیا۔ میں اس کا ممنون ہوں۔ پر میں نے اس غظیم کا گلا گھونٹ کر اسے ختم کر دیا ہے۔ اور اسی غظیم کی لاش پر میں نے ایک نئے غظیم کی بنیاد رکھی ہے جسے پرانے حالات کا احساس نہیں اور جو آسیہ کا منسوب نہیں ہے۔ یا آپ یوں کہہ لیں انکل جب غظیم تھا اس وقت آسیہ نہ تھی اب جبکہ آسیہ ہے تو غظیم کہیں کھو گیا ہے۔

سعادت نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ تم آسیہ سے ضرور شادی کرو۔ میں چاہتا ہوں۔ تم آرام و سکون سے رہو۔ اگر آسیہ سے نہیں تو پھر عاصفہ سے شادی کر لو۔ اس نے قیصر سے طلاق لے لی ہے۔

غظیم کے ہونٹ سکڑ گئے۔ افسانہ بانی نفرت میں کہا۔ میں اس سے نفرت

کہتا ہوں۔

پھر تم کیا چاہتے ہو۔

میں تو کچھ بھی نہیں کہتا۔ بس دن کاٹ رہا ہوں۔

یہ ٹھیک کس کا ہے۔

میرا اپنا ہے۔

اسے کسی کو دیدو اور میرے ساتھ گھر سے چلو

یہ میری آمدنی کا ذریعہ اور سہارا ہے۔ میں اسے کیونکہ کسی دوسرے کے حوالے

کر سکتا ہوں۔ اور پھر اس گھر سے میرا کوئی تعلق جس سے میری ماں اور بہنوں

کی لاشیں اٹھ چکی ہے۔

سعادت کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اچھے بیٹے ضد نہیں کرتے۔ اسے دیدو کسی اور کو اور میرے ساتھ چلو۔

نہیں انکل! میں نہیں جاؤنگا۔ میں اس ماحول میں خوش ہوں۔

میری مانوں اور عاصفہ سے شادی کر لو۔

میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔

کون ہے وہ۔ مجھے اس کا پتہ دو۔ میں اس کے والدین سے بات کر کے

تمہاری شادی کی بات کرتا ہوں۔ میں صرف تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں بیٹے!

اس کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ پر کہیں کھو چکی

ہے۔ میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔ ایک روز اسے ضرور ڈھونڈ



نکالوں گا۔

تو پھر میں اسی کی شادی کر دوں ؟  
ضرور کر دیجئے۔

پاس کھڑی آسیہ ادا اس ہو گئی۔ اس کا رنگ ہلکی ہو گیا تھا اور ٹانگیں کچکچا  
اٹھی تھیں۔ سعادت نے کچھ روپے نکال کر عظیم کی طرف بڑھاتے  
یہ رکھ لو بیٹے! تمہارے کام آئیں گے۔

عظیم نے انکار کر دیا۔ میرے پاس ہیں انکل!

تو پھر تم میرے ساتھ نہیں چلتے

جی نہیں

تمہارا آخری فیصلہ ہے۔

جی ہاں۔

پھر مجھے اجازت دو میں چلتا ہوں۔

عظیم آگے بڑھ کر سعادت سے لپٹ گیا۔ دونوں چچا بھتیجی گلے مل  
کر علیحدہ ہو گئے۔ سعادت آسیہ کے ساتھ کار میں بیٹھ کر شاہ عالم گیٹ کی طرف  
بڑھ گئے تھے۔ اور عظیم اپنا رہڑہ کھینچا ہوا موچی گیٹ کی طرف چل دیا۔

کل اور سیبل کو سرور قلی کئے ہاں رہتے ہوئے کئی ماہ گزر گئے تھے۔ کل کو  
بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ایک ہائی اسکول میں ستانی کی جگہ مل گئی تھی۔ اس  
کے علاوہ اس اسکول کی استانیوں نے ایک ٹیوشن سنٹر کھول رکھا تھا۔ انہوں نے

کمل کو بھی وہاں رکھ لیا۔ اس طرح وہ پہلے پہر سکول پڑھاتی اور پچھلے پہر ٹیوشن سنٹر چلی جاتی۔

جو سمجھو وہ کماتی بوڑھی سیدیاں کو دے دیتی۔ گردشیں کچھ کچھ معمم گئی تھی اور زندگی میں ایک سکرت سا آگیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ہر وقت مصروف رکھ کر اپنے تاریک اور بھیاں تک ماضی کو بھلا دینا چاہتی تھی۔ سرور قلی کے ہاں وہ اب کراچی جیسی پرسکون زندگی بسر کرنے لگی تھی۔ یہاں رہتے ہوئے۔ اسے عظیم اور زیادہ یاد آنے لگا تھا۔

ایک روز جب وہ کوچنگ سنٹر میں پڑھا کر گھر لوٹ رہی تھی۔ ریلوے کوارٹرز کی حدود میں اسکی ڈبھیٹر بنخشو سے ہو گئی۔ اس کے ساتھ وہ بد معاش بھی تھا جس نے اپنے کوارٹرز میں کمل سے زیادتی کرنا چاہی تھی۔ کمل نے نگاہیں بچا کر آگے بڑھنا چاہا مگر بنخشو اس کے سامنے آکھڑا ہوا اور کمل کا بازو پکڑ لیا۔ بنو بصورت تنکی! کب تک ہم سے چھپی رہو گی۔

اپنا بازو چھڑا کر خفگی میں کمل نے کہا۔ ہوش میں رہو بنخشو! بنخشو کا لہجہ وہی بد معاشوں والا تھا۔

کون کافر تمہیں دیکھ کر ہوش میں رہ سکتا ہے۔

بنخشو نے دوبارہ کمل کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ پر اس سے پہلے ہی کمل نے اس

کے منہ پر ایک بھر توڑ تھپڑ دے مارا۔

ذیل! بے غیرت۔ شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے۔



بخشو بھی ڈھیٹ ہو گیا تھا۔

شرم کی بھی تم نے خوب کہی۔ جب تمہارا کام ہی عزت پہنچا ہے۔ تو پھر اس کے لیے ہم سے نفرت کیوں۔ جتنا مال مانگو ہم دیں گے۔ بس تم ہمارے ساتھ چلو۔

وہ مکمل مرچکی ہے۔ میں یہاں عزت کی زندگی بسر کر رہی ہوں۔ چلو ہماری خاطر ایک بار پھر اپنے پرانے راستوں پر چل دو۔ اور ہماری خاطر تمہیں ایسا کرنا ہوگا۔

مکمل آگے بڑھ گئی۔ بھول ہے تمہاری۔

بخشو اس بد معاش کے ساتھ مکمل کے پیچھے چلتا ہوا بولا۔

میں جانتا ہوں تم ان دنوں۔ سرور قلی کے ہاں رہ رہی ہو۔ اب بھی وقت ہے میری بات مان جاؤ۔ اور میرے ساتھ چلو۔ میں نے بھی وہ عمارت چھوڑ دی ہے۔ وہاں سے غلیم نے مجھے تم سے زیادتی کرنے کی وجہ سے ذلیل کر کے نکال دیا تھا۔ میں اب مصری شاہ رہ رہا ہوں وہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں میرے ساتھ چلو۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو یاد رکھو میں ان کو ارٹروں کے سب لوگوں کو جمع کر کے تمہارے سیاہ کارناموں اور تمہاری تاریک زندگی سے انہیں آگاہ کر دوں گا۔ پھر دیکھو گے تم کیسے یہاں رہ سکتی ہو۔

غلیم کا نام سن کر مکمل اداس ہو گئی اور اس کی آنکھیں مناک ہو گئی تھیں تاہم وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گھر داخل ہو گئی۔ سیبل سیداں کے پاس بیٹھی پڑھ

رہی تھی۔ وہ ان دونوں کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ سببوں نے اسے چائے کا گرم گرم کپ لاکر دیا اور وہ پینے لگی۔

اس کا نازک گلابی بدن کانپ رہا تھا۔ دل ڈوب رہا تھا۔

بخشو بد معاش سے اسے خطرے کی بوجھ آنے لگی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ کمر کے کان کھڑے ہو گئے۔  
اور وہ اٹھ کر صحن میں آگئی۔ سرد جو صحن میں بیٹھا پودینے کی کیاری سے فالتو جڑی بوٹیاں نکال رہا تھا۔ اٹھا اور دروازہ کھولا۔ دروازے پر بخشو اور اس کا ساتھی کھڑے تھے۔ سرد نے ان سے پوچھا

کس سے ملیں گے؟

بخشو بولا۔ ملنا تو کسی سے نہیں۔

تو پھر کیا بات ہے۔

یہاں تمہارے باں کوئی ایسی لڑکی رہتی ہے جس کا نام کل ہے؟

رہتی ہے۔ پر تمہارا اس سے تعلق؟

اسے ہمارے حوالے کر دو۔

سرد گرم ہو گیا۔

تمہارا اس سے کوئی رشتہ ہے؟

اس سے کوئی رشتہ تو نہیں۔ پر تم اسے یہاں سے نکال دو۔ وہ ایک

ادب و عزت بیچنے والی لڑکی ہے۔ ان کو اڈروں میں اس کا رہنا مناسب نہیں۔



تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اسے نکال باہر کرو۔

سرور کا لہجہ زہر آلود ہو گیا۔

یہ غلط ہے۔ جھوٹ، بہتان اور اتہام ہے۔ وہ ایک شریف اور معصوم لڑکی

ہے۔ وہ حالات کی ستانی ہوتی ہے اور میرے پاس اس نے پناہ لے رکھی ہے۔ وہ

اب میری بیٹی ہے اور اس کی حفاظت مجھ پر فرض ہے۔

بخشو اور اس کا ساتھی بد معاش اونچی اونچی آواز میں شور کرنے لگے۔ وہ لڑکی

بے آبرو ہے۔ فحاشہ اور ادب باش ہے۔ وہ عزت بیچ کر گزارہ کرتی ہے۔ یہ شریفوں

کا عملہ ہے۔ وہ یہاں نہیں رہے گی۔ نکالو اسے باہر۔ ہم اسے یہاں نہ رہنے دیں گے۔

سب کے گھر جوان بیٹیاں ہیں۔ ان سب کو ارٹروں کا ماحول خراب ہو جائیگا۔ اسے

یہاں سے نکال دو۔ ورنہ ہم تمہارے خلاف محکمانہ کارروائی کرائیں گے۔

شور سن کر کو ارٹروں کے کافی لوگ باہر نکل آتے تھے۔ بخشونے وہاں جمع ہونے

والے لوگوں سے کل کے متعلق سنو ب جھوٹی سچی کہیں۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ کو ارٹروں

کے لوگ بھی ان دونوں کی حمایت میں بول پڑے اور شور کرنے لگے۔

اس گندگی کو نکالو یہاں سے

کوئی کہتا۔ یہ کوٹھا نہیں ہے۔

کوئی اور فتویٰ دیتا۔ ایسی فحاشہ دوسری بچیوں کو بھی گمراہ کرے گی۔ محلے کے

لوگ شور کرنے لگے۔ صحن میں کھڑی کل کا بدن کانپ رہا تھا اور بچاری سر جھکاتے

خاموش کھڑی وہ دور رہی تھی۔

سرور نے ہاتھ لہرا کر لوگوں کو خاموش کرایا اور ان سے کہا۔

بھائیو! میری بات سنو۔ پہلے مجھے لڑکی سے بات کرنے دو۔ ہو سکتا ہے یہ دونوں جھوٹے ہوں اور اسے الزام دے کر بدنام کرنا چاہتے ہوں۔ میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اگر یہ سچ ہوا تو میں وہی کردنگا جو آپ لوگ فیصلہ دینگے۔

ایک معزز آدمی نے کہا۔

ہم یہیں کھڑے ہیں۔ تم اس سے بات کراؤ۔

کمل صحن سے کمرے میں چلی گئی تھی۔ سیدال بچادی پریشانی کے عالم میں ابھی تک صحن میں کھڑی تھی۔ سیبل جو کمل کے پاس کھڑی تھی۔ سخت پریشان اور اس دکھائی دے رہی تھی۔ وہ عجیب طرح سے بار بار کمل کی طرف دیکھتی تھی جیسے وہ کمل کی حالت پر افسوس کر رہی ہو۔

سرور اندر آیا۔ سیدال بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموشی سے روتی ہوئی کمل کو دیکھتا رہا۔ پھر تھکی اور نڈھال سی آواز میں پوچھا۔  
کمل!

کمل نے مردہ سی آواز میں کہا۔ جی!

تم نے سنا باہر کھڑے لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔

سب کچھ سن چکی ہوں بابا!

پھر ان کے جواب میں تم کیا کہتی ہو۔ کیا وہ سچ کہتے ہیں۔



کمل تھوڑی دیر تک ہیب سناٹے اور لامحدود خاموشی میں ڈوبی تھو کہ  
نگلتی رہی اس نے آنکھیں بند کر لی تھی جیسے حالات کا دیا ہوا زہری رہی ہو۔ پھر  
شاید اس نے کوئی فیصلہ کر لیا تھا۔

اور دھکیلے لہجے میں اس نے کہا۔

وہ ٹھیک کہتے ہیں بابا! میں گناہ گار ہوں، فحاشہ اور عزت فروش ہوں۔  
کمل پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ میں سب کچھ ہوں بابا۔ مجھ جیسی بے بس لڑکی کو اس  
دھرتی پر رہنے کا حق ہی نہیں ہے۔

سرور نے شکوہ کیا۔

تم نے اپنے جو حالات مجھے بتائے تھے ان میں ان باتوں کا ذکر تو نہ تھا۔  
کمل نے بہتے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

میں نے مصلحتاً ان واقعات کا ذکر نہ کیا تھا۔ میں عزت بچتی رہی ہوں مگر  
مجبوری کے تحت۔ میرا باپ بیمار تھا۔ کوئی کمانے والا نہ تھا۔ کون میرے باپ کا  
علاج کرتا۔ کون ہمارے گھر کے اخراجات چلاتا۔ میں نے یہ سب کچھ مجبوری کے  
تحت کیا ہے۔ میں ایک پاکدامن اور باعزت و عصمت لڑکی تھی۔ کچھ لوگوں نے  
زبردستی میری عزت لوٹ لی۔ پھر چند غلط باتوں میں چڑھ گئی اور اس تاریک  
اور گھناؤنے راستے پر چل پڑی۔

سک سک کر روتے ہوئے کمل نے پھر کہا۔

کاش میرا کوئی بھائی ہوتا تو آج مجھے یوں ذلت و رسوائی دیکھنا نصیب نہ

ہوتی۔ میں بھی اس کے ساتھ باعزت زندگی بسر کرتی اور ————— اور یہ  
آوارہ کتوں کی طرح شہر کی گلیوں میں گھومتے بد معاش سر عام یوں میری عزت نہ  
اچھالتے پھرتے۔

بیسبل کھڑی زور زور سے رو رہی تھی۔ سرور کی پلکیں جھپک جھپک گئیں اور بڑی  
ہمدردی سے اس نے پوچھا۔

تمہارا کوئی دور و نزدیک کا رشتہ دار نہیں ہے؟

اس بھری دنیا میں صرف ایک سہارا تھا۔ غلام اس کا نام ہے۔ وہ میری پسند  
ہے۔ میرے ابو میری اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ پر وہ بھی اب مجھ سے خفا  
ہیں۔ مجھ سے روٹھ گئے ہیں۔ حالات نے مجھے ان کے قابل ہی نہیں رہنے دیا۔ ان  
کے علاوہ اس آتش دہن سنسار میں میرا کوئی بھی نہیں۔  
میں تنہا ہوں۔

جنگل میں لکڑے تنہا اور سوکھے درخت کی طرح اکیلی ہوں۔

خدا بھی مجھے بھول گیا ہے۔

تقدیر بھی مجھ سے خفا ہے۔

کل زور سے پھٹ پڑی۔

میں اکیلی ہوں۔ تنہا اور ایک ہی اکائی ہوں۔ میرا کوئی خدا چھوڑنا خدا

بھی نہیں ہے بابا!

سرور کھڑا ہو گیا۔ ٹھہر۔ میں ان لوگوں سے بات کرتا ہوں۔ سرور جب



باہر آیا تو بخشو نے جھٹ پوچھ لیا۔

کیا کہتی ہے ؟

وہ اپنا گناہ تسلیم کرتی ہے۔ اپنی ساری غلطیاں اور کوتاہیاں مانتی ہے۔ میں نے اس کے حالات سنے ہیں جو کچھ بھی اس نے کیا مجبوری اور بے بسی کے تحت کیا ہے۔ اس دنیا میں کوئی اس کا سہارا کوئی نگہبان و آسرا نہیں۔ کچھ نا عاقبت اندیش ہاتھوں نے اسے غلط راہ پر ڈال دیا تھا۔ اب وہ سنبھل چکی ہے اور با عزت زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔

سرور کا اور مکمل کی بھرپور حمایت میں پھر بولا۔

وہ تنہا اور اکیلی ہے۔ میری آپ لوگوں سے التجا ہے اسے میرے پاس رہنے کی اجازت دے دی جائے اگر ہم نے اسے نکال دیا تو ایک بار پھر وہ گناہ آلود راستوں پر چلنے کے لیے مجبور ہو جائیگی۔ اب وہ سنبھلی ہوئی ہے اور با عزت زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس وقت اس کی مدد کرنا — ایک ثوابی عمل، قومی فریضہ اور ایک معاشرتی اصلاحی اقدام ہو گا۔ میں خدا کے نام پر آپ لوگوں سے التجا کرتا ہوں کہ اسے یہیں رہنے دیں۔

پران بیہودہ اور خام ذہن رکھنے والے لوگوں نے سرور کی کوئی التجا نہ مانی اور شور کرنے لگے۔ اصل میں بخشو اور اس کا ساتھی سارا کام بگاڑ رہے تھے طرح طرح کی آوازیں سرور کے کانوں میں پڑنے لگیں۔

ہم ایسی لڑکی یہاں نہ رہنے دیں گے۔

تم بھی اس کی آمدنی کھاتے ہو۔

تمہارے کوارٹر کو آگ لگا دیں گے۔

محلے کے ایک بزرگ۔ لوگوں کے ہجوم سے نکلے اور اور سردر سے کہا۔ تم مجھے اس لڑکی کے پاس لے چلو۔ میں خود اس سے بات کرتا ہوں۔ سردر اسے اندر لیکر آیا۔ کمرے میں اکیلی سیان۔ جویران ویران کھڑی تھی۔ مکمل اور سیبل وہاں نہ تھیں۔

سردر نے سیدان سے پوچھا۔

مکمل کہاں گئی۔

سیدان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

وہ پچھلے دروازے سے۔ سے اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے بہت روکا۔ پر وہ کہتی تھی میں اب یہاں رہنے کے قابل نہیں رہی اور اپنا سامان اٹھا کر وہ چلی گئی ہے۔ سردر اس بزرگ کے ساتھ باہر آیا اور سر جھکا کر مجروح و گھائل آواز میں کہا۔ وہ خود یہاں سے چلی گئی ہے۔

لوگ خاموشی سے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بخشوا اور اس کا ساتھی بھی تیزی سے ایک طرف لپکے۔ شاید وہ مکمل کو ہاتھ سے کھونا نہ چاہتے تھے۔ پر وہ کامیاب نہ ہوتے مکمل جانتی تھی وہ اس کا پیچھے کریں گے۔ لہذا وہ انہیں چکر دیکر اس طرف سے نکل گئی تھی۔ جہاں کوئی عام راستہ نہ تھا۔

دونوں بہنیں کوارٹروں کو بھول بھلیوں سے نکل کر شرک کنارے ایک دھنٹ



تیلے آکھڑی ہوئیں۔ سیبل کچھ دیر ٹکڑ ٹکڑ مکمل کو دیکھتی رہی پھر اس نے بچوں کی سی  
ضد میں پوچھا۔

اب ہم کہاں جائیں گے باجی !

سیبل کے کندھے پر پیاد سے ہاتھ رکھتے ہوتے مکمل نے کہا۔

تقدیر ہی ہم سے خفا ہے بے بی !

ہم سے ہی کیوں خفا ہے باجی۔ اور لوگ بھی تو ہیں۔ وہ ہماری طرح کیوں

نہیں ہیں۔ مکمل رو دی۔ یہ لوگ بڑے ظالم ہیں میری بہن۔

پر ہم اب کہاں جائیں گے۔

اپنے سکول چلتے ہیں بے بی۔ وہاں سوشل میں دونوں بہنیں رہیں گی۔

وہاں اور استانیات بھی رہتی ہیں۔ جگہ بھی ہے۔ ہم دونوں بہنیں بھی وہاں

رہ لیں گی۔ اس طرح یہاں سے روز سکول کو جانا آنا بھی ختم

ہو جائے گا۔

ایک اور بات ہے باجی !

کیا ؟

ہم عظیم بھاتی جان کے پاس کیوں نہ چلی جائیں۔

نہیں بے بی ! میں اب اس قابل نہیں کہ عظیم کے پاس جا کر رہوں۔ پھر

وہ مجھ سے ناراض اور خفا ہی ہیں۔ سیبل ضد کرنے لگی۔

کیوں اس قابل نہیں ہو باجی ! اتنے اچھے بھتیہ ہیں ہمارے۔ وہ ان لوگوں

کی طرح ہمیں تھوڑا ہی نکال دیں گے، وہ ہمیں ضرور اپنے ساتھ رکھ لیں گے۔

کمل اور زیادہ روپڑی۔

نہیں۔ بے بی! ہم وہاں نہیں جائیں گے۔ لوگوں نے پہلے ہی ہمیں اس عمارت سے نکال دیا ہے۔

کیوں نہیں جائیں گے باجی! تم جانتی ہونا۔ ابو آپ کی شادی غلام بھائی سے کرنا چاہتے تھے۔ پتہ ہے نادن میں کتنی کتنی بار ابو مجھے بھیا کو مسد سے بلانے کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ ابو انہیں بیٹا کہتے تھے وہ میرے بھائی ہیں میں ضرور ان کے پاس جاؤنگی۔ چلو نا باجی ان کے پاس تم نے سرور بابا سے خود کہا تھا کہ صرف غلام بھائی ہی اس دنیا میں ہمارا واحد سہارا ہیں تم جھوٹ کہتی ہو باجی وہ ہم سے ناراض نہیں ہیں۔ تم چلو ان کے پاس پھر دیکھنا وہ ہمیں دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔

کمل نے سیبل کو لپٹا لیا اور رونے لگی۔

سیبل پھر لپٹی۔

میری مانو باجی! چلو غلام بھائی کے پاس چلتے ہیں۔ یوں ہی ہم دونوں بہنیں دھکے کھاتی پھر رہی ہیں۔ آپ غلام بھائی سے شادی کر لینا۔ پھر ہم ان کے پاس رہیں گی۔ وہ مجھے سکول بھی چھوڑ آیا کریں گے باجی! بڑے اچھے بھیا ہیں میرے۔



کمل نے زور سے سیبل کو بھینچ لیا اور روتے روتے کہا۔  
نہیں بے بی۔ ہم اسکول جائیگی۔ عظیم اب مجھ سے شادی نہ کریں گے۔  
اسی لمحہ ایک خالی رکشہ وہاں سے گزرا۔ کمل نے اسے روکا اور دونوں بہنیں  
سکول روانہ ہو گئیں۔

---



اس روز جمعہ تھا۔ عظیم نہا کر اپنے ٹھیلے کے پہیوں پر پانی ڈال رہا تھا۔  
 مندر کے اندر شاموں، آفتاب اور رفعت بیٹھے تھے۔ رفعت ناشتہ تیار کر چکی  
 تھی۔ پھر شاید سوچی سمجھی سکیم کے تحت ایک عمل شروع ہوا۔ رفعت نے قرآن پاک  
 کھولا۔ اور پڑھنا شروع کیا۔ ساتھ ساتھ وہ ترجمہ بھی پڑھتی جاتی تھی۔  
 عظیم جو ٹھیلے کے پہیوں پر پانی ڈال رہا تھا اس کے کانوں میں رفعت کی گونجتی  
 ہوئی آواز رس گھولتی چلی گئی۔

وہ (خدا) بڑا عالی شان ہے جس کے قبضہ میں تمام سلطنت ہے اور وہ  
 ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے  
 کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ ہے اور وہ زبردست بخشنے والا ہے جس نے اوپر



تے سات آسمان پیدا کیے تو اس صفت میں کوئی خلل نہ دیکھے گا۔

عظیم گوہریوں پر پانی ڈال رہا تھا۔ مگر ان الفاظ کا سحر سے وہاں روکے ہوئے تھے اور وہ بڑی توجہ اور غور سے سن رہا تھا۔ رفعت کی آواز پھر گونجی تھی۔

تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے۔ کہیں تمہیں خلل نظر آتا ہے؟ بلاتال تو نے کئی بار دیکھا۔ اب کی باتال سے پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ۔ نگاہ ذلیل و در ماندہ ہو کر تیری طرف لوٹ آئے گی۔

عظیم سوچوں میں کھو گیا تھا۔ لیکن جلد ہی رفعت کی طرف سے ایسے الفاظ نور کے روشن دھارے کی مانند آئے اور اس کی سماعت سے گزرتے چلے گئے ”اور جو لوگ اپنے رب کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے اور وہ بری جگہ ہے۔ جب وہ لوگ اس میں ڈالے جائیں گے تو اس کی بڑی زور کی آوازیں سنیں گے۔ اور وہ اس طرح جوش مارتی ہوگی جیسے معلوم ہوتا ہے پھٹ پڑے گی۔“

اور وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لیے زمین پیدا کی سو تم اس کے راستوں پر چلو اور خدا کی روزنی سے کھاؤ۔ اور اسی کے پاس دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے۔ کیا تم لوگ اس سے غافل ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے اور وہ تم کو زمین میں دھنسا دے تو زمین بھی تمہارا نہ لگے یا تم لوگ اس سے بے خبر ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے اور وہ تم پر نڈھال ہو ا بھیج دے۔ تو عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ میرا ڈرانا کیسا تھا۔

عظیم کا ذہن کہیں ڈوب کر ایک گہرے غوطے کے بعد ابھرا اور الفاظ پھر اس کے کانوں میں نور اور روشنی کی لہریں بن کر اتر گئے۔

اور آپ کہہ دیجئے۔ اچھا بتاؤ پانی (جو کنوؤں میں ہے) نیچے اتر کر غائب ہو جائے سو وہ کون ہے جو تمہارے لیے کنویں کی سوت کو جاری کر دے۔

رفعت نے قرآن پاک بندہ کیا اور عظیم کو آواز دی۔

بھائی جان! ناشتہ کر لیں۔

عظیم سنبھلا۔ ناشتہ کر کے جب وہ اپنا ٹھیلہ کھینچنے لگا تو رفعت بھاگتی ہوئی نکلی اور بڑے پیار سے کہا۔

آج دوپہر کا کھانا گھر آ کر کھانا بھیا!

عظیم نے تعجب سے پوچھا۔

کوئی خاص بات؟

نہیں بھیا۔ بس تم دوپہر کو گھر آ کر کھانا کھانا۔ آدگے نا بھیا تم کہتی ہو تو آجاؤ گا

ضرور آنا بھیا۔ نہیں تو میں خود آپ کو لینے منڈی آجاؤں گی۔ عظیم نے اس کے سر

پر دھپ لگائی۔ میں آجاؤں گا۔ تم منڈی نہ آنا۔ عظیم ٹھیلہ کھینچتا ہوا باہر نکل گیا۔

جب وہ سکول کے پاس سے گزر رہا تھا تو بچے وہی دعا پڑھ رہے تھے۔

گلشن میں تیرا جلوہ دیکھ

پھولوں کی ادائیں کی صدا

دیتی ہے پتہ یہ باد صبا تو باغ جہاں کا مالی اسے خالق کون و مکان عظیم کھڑا



ہو کر دعا سننے لگا۔ آج اس نے خٹکی اور ناراضگی کا اظہار نہ کیا تھا۔

دوپہر تک وہ اپنی مزدوری کرتا رہا۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب وہ مندر آیا۔ نہا کر اس نے کھانا کھایا اور جب وہ جانے لگا تو رفعت نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

ٹھہر کر جانا بھتیہ۔ تھوڑی دیر آرام کر لو۔ رفعت نے ایک چار پائی اندر سے نکال کر اٹناس تلے لگا دی۔ ذرا آرام کر لو۔ عظیم چپ چاپ کمریدھی کرنے کو لیٹ گیا۔ یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہو رہا تھا۔ کیونکہ شامو نے محلے کی مسجد کے خطیب سے بات کر رکھی تھی اور آج جمعہ کے روز انہوں نے عظیم کو متعلق بولنا تھا۔

عظیم کو لیٹے ہوئے تھوڑی سی دیر ہوئی تھی کہ مسجد کا لاؤڈ سپیکر کھٹکا۔ پھر خطیب نے تلاوت کی جس آیت کی تلاوت کی گئی تھی وہ بھی خدا پر یقین رکھنے کے متعلق تھی اس وقت رفعت کمرے سے نکلی اور عظیم کو پکارا۔

بھتیہ! سو گئے ہو؟

عظیم نے سر اٹھا کر کہا۔

نہیں تو۔ میں جاگ رہا ہوں۔

رفعت مطمئن ہو کر اندر چلی گئی۔ خطیب تھوڑی دیر تک دھیمے دھیمے لہجے

میں اس آیت کا ترجمہ پھر تشریح کرتے رہے۔ پھر گویا وہ آتش دہن ہو کر جوش و جلال میں بدل اٹھے تھے۔

کارل مارکس کے جانشینو !

ڈارون کے پیروکارو !

ظلمت کے فرزندو !

شیطان نما انسانو !

ملحدو ! فاسقو ! دہریو ! خدا کے منکرو ! — خدا ہے اور وہ قائم بالذات ہے جبکہ انسان اس کے سامنے مجبور محض اور قائم بالغیر ہے۔ اگر — اگر خدا نہیں ہے تو یہ تاریک و سرد فضا تیں، بارش و آندھی یہ خوشبو و رنگ، طلوع و غروب، شام و سحر، یہ صحرا و بیابان، پہاڑ جگل اور غراتے ہوتے نیلے سمندر۔ یہ عروج و ماہ اور زوال شب و یہ بادل و گھٹائیں کون سی ہستی ہے جو ان سب کا انتظام و انصرام نبھالے ہوئے ہے۔

کس کے حکم سے ؟ کس ذات کے کہنے پر سورج کبھی خطا ستوار اور کبھی جدی و سرطان پر چمکتا ہے ؟ وہ کون ہے جس نے سورج کی قرمزی شعاعوں کو توانائی بخشی۔ کس کے ایما پر چاند اپنی ماہانہ منزلیں بغیر رُکے اور دم لیے طے کرتا رہتا ہے۔ کون سی ہستی ہے وہ جس نے نیلے رنگ وول کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ طوفان و باد کو کون کنٹرول کرتا ہے۔

اے کافر و انجیث روح ! سب کو اس کی سزائی اور انکو اس کی سزائی دنگت دینے والا کون ہے۔ کس نے آدم کے بت میں روح پھونکی۔ کس کے کہنے پر نوح نے کشتی تعمیر کی۔ کیوں نذرشت نے بیرون اور اہرن قوتوں کا سبق دیا۔



کس روشنی اور کس نردان کی تلاش میں مہاتما بدھ نے برسوں کا بن باس کاٹا۔ کوہ طور پر پھونکنے سے ہم کلام ہوا۔ داؤد نے کس کی ثنا کے گیت اور حمد کے نغمے الاپے۔ ایوب کے قدموں میں کس نے میٹھا و شفاف زمزم جاری کیا۔ یونس کو مچھلی کے پیٹ سے کس نے نکالا۔ کون ذات ہے وہ جس نے موسیٰ اور ہارون سے فرعون جیسے سرکش حکمران کو رسوا و ذلیل کیا۔ کس کی ہستی ہے وہ جس نے نرود کی آگ کو ابراہیم پر ٹھنڈا کیا۔ کسی کی خوشنودی میں ذکر یا نے آسے میں چر جانا قبول کیا۔ کس کی رضامندی کے ساتھ عیسیٰ مردوں کو زندہ کرتے رہے۔ کس کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر محمد عربی نے طائف میں اپنا بدن ہولہاں کرایا۔ کس کی راہ میں وہ تین سو تیرہ ارب بے سرو سامان ساتھیوں کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں قریش سے نبرہ آزما ہو گئے تھے۔

آخر دنیا کے اتنے پیغمبر اور رشیوں نے جنہیں دنیا کے اکثر مذاہب مانستے ہیں۔ کیونکہ خدا کی وحدانیت اور الوہیت کے گیت گاتے کیوں انہوں نے خدا کو ماننے اور اس کے وجود کو تسلیم کرنے کی تعلیم دی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے سے مشورہ کر کے ایسا کیا تھا۔ جبکہ ان کے درمیان سینکڑوں اور ہزاروں برسوں کا فاصلہ، دوری، بعد اور تفاوت ہے۔

میرے بھائیوں! خدا ہے۔ اس کی تکوئی قوت سے یہ دنیا پیدا ہوئی وہ نور کا ایک دھارا ہے جو ازل سے ابد تک بہتا رہے گا۔ اس کی ازلی اور وہابی قوتوں کے سبب انسان اس دنیا میں جہد و عمل کا کھیل کھیل رہا ہے۔



وہ لاہوت کا مفتح ہے اور اس کی موجودگی کا جمال لایزال ہے۔ وہ وہی ہے جس نے نار جہنم، رات کی وسعت اور سمندروں کا مدد و جدر جاری کیا؛ خدا کے منکر و! اپنے دل میں خشیت ایزدی کو جگہ دو۔ اور اپنے مالک و خالق کے سامنے اپنی شہریت کا حق ادا کرو۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ وہ لاریب ہے اس کی ذات پر ایمان لاؤ۔ ڈرو اس وقت سے جب وہ محشر ہر پا کرے گا اور ہر انسان سے اس کا حساب لیکر گناہوں کی سزا اور نیک اعمال کی جزا دیگا۔ فاسق و فاجر لوگو! اس درد میں بھی جیکہ سائنس و حکمت اپنے ارتقاء کی انتہائی منزلیں طے کر چکی ہے۔ کوئی بھی مشینیں، کوئی آلہ، کوئی چیز ایسی نہیں جس کا کوئی انجینئر اور بنانے والا نہ ہو۔ پھر یہ بھیے ممکن کہ یہ کائنات جو اس قدر وسیع و عریض آسمان و زمین پر مشتمل ہے اس کا پیدا کرنے والا کوئی نہ ہو۔ ضرور وہ ہے اپنے ارادہ گرد کا معائنہ کر دے۔ کائنات کے ہر ذرے میں۔ اشجار کے ہر پتے میں تمہیں خدا کی تکوینی قوت نظر آئے گی۔

دہریت کے علمبردارو! ہر دور میں، ہر قوم نے ہر قبیلے نے خدا کی ہستی کو کسی نہ کسی صورت میں تسلیم کیا ہے۔ قدیم آسٹریلیوں نے اسے بادلوں کا باپ کہہ کر کپارا۔ مشرقی قوموں نے اسے ایک بڑا اژدہ کہا۔ نیوزی لینڈ کے قدیم مورس قبائل نے اس مادہ رانی ہستی کو اتوا کہہ کر یاد کیا۔ نیوگنی اور جزائر سلیمان کے لوگوں نے اسے مانا کا نام دیا۔ پولینیشیا کے رہنے والوں نے تارو اور افریقہ کے وحشی قبائل



نے خدا کو انگائی کہہ کر پکارا۔

قدیم مشرقی قوموں نے اسے ادا کر دیا۔ قدیم امریکیوں نے اسے  
نوٹکا اور لنکا کے لوگوں نے اسے مخالف روح کے نام دیتے۔ مونجو دارو  
کے باسیوں نے اسے عظیم ہستی کو ادا، گونڈ قبائل نے بھگوان اور قدیم  
سامیوں نے اسے ایل کے نام دیتے یہی ایل آگے چل کر الہی بن گیا۔  
آریوں نے اسے برما۔ ایرانیوں نے آہو فردا، مصریوں نے آمین  
اور قدیم یونانیوں نے اسے عقل اول کہہ کر اس کی عبادت کی اور اسے  
مدد کے لیے پکارا۔

رفعت نے باہر آ کر دیکھا۔ عظیم کا جسم کپکپا رہا تھا اور وہ کچھ بدلا بدلا سا لگ  
رہا تھا۔ وہ اٹھا اور اپنا ٹھیلہ کھینچتا ہوا باہر نکل گیا۔ رفعت خاموشی سے  
اسے دیکھتی رہی۔ عظیم جب باہر نکل گیا۔ تو رفعت چونکی۔ مسجد میں خطیب کی تقریر  
ابھی جاری تھی اور وہ اس کے خاتمے تک عظیم کو وہاں روکنا چاہتی تھی۔ وہ چلاتی  
ہوتی عظیم کے پیچھے بھاگی۔

بھیا! بھیا!

لیکن عظیم تو اس ڈر بنما عمارت کے احاطے سے شرک پر چڑھ چکا تھا۔ رفعت  
اسے پکارتی اور بھاگتی ہوتی باہر نکلی۔ اس کا دھیان دور شرک کنارے جاتے  
ہوتے عظیم کی طرف تھا۔ بے خیالی میں کیا لگی ہی وہ ایک تیز رفتار گاڑی سے ٹکراتی  
اس کا جسم رندہ گیا اور بچاوی چور چور ہو گئی۔

گاڑی کی دلخراش بریکوں کی آواز پر شامو اور آفتاب مندر سے نکل کر سڑک پر آئے تھے۔ رفعت سڑک پر خون میں لت پت تڑپ رہی تھی۔ شاموں اور آفتاب اسے سنبھالنے لگے اور روتے بھی جا رہے تھے۔

عظیم نے بھی حادثہ دیکھ لیا تھا۔ اپنا ٹھیلہ وہیں چھوڑ کر وہ بھاگا۔ رفعت کو اپنی گود میں سیٹھتے ہوئے اس نے ہچکیاں لیکر روتے ہوئے آفتاب سے کہا۔  
آفتاب! تم کسی خالی رکشے کو روکو اسے ہسپتال لے چلیں۔  
جلدی کرو۔

آفتاب سڑک کنارے کھڑے ہو کر تیزی سے گزرتے ہوئے رکشے دیکھنے لگا۔ رفعت کی حالت یوں لگ رہی تھی جیسے وہ لمحہ بہ لمحہ مذبذبی جا رہی ہو۔ اپنا خون آلود ہاتھ رفعت نے عظیم کے چہرے پر پڑے پیار سے پھیرتے ہوئے کہا۔  
بیٹا! زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں مر رہی ہوں بیٹا۔ کیا خدا کے علاوہ کوئی ایسی ہستی ہے جو مجھے موت سے بچالے۔

عظیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ جھک کر رفعت کی خون آلود پیشانی اس نے چوم لی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔  
ٹوٹی آواز میں رفعت پھر بولی۔

بیٹا! کیا تم اب بھی نہیں مانتے کہ خدا ہے؟  
عظیم نے رفعت کو لپٹا لیا اور روتے روتے کہا۔  
خدا ہے میری بہن۔ میں مکینہ ہی بھٹک گیا تھا۔



رفت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ موت میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ  
میں ہلکے سے اس نے کہا۔

اگر میرے مرنے سے آپ خدا کو ماننے لگے ہیں بھیا! تو قسم خدا پاک  
کی میرے لیے یہ سودا مہنگا نہیں۔ رفعت نے بھی عظیم سے لپٹ جانا چاہا۔  
لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ اس کے جسم نے ایک پھریری سی لی اور اس کی روح  
پرداز کر گئی۔ عظیم اس کی لاش مندر لے آیا۔ اور تینوں اس کی لاش سے لپٹ  
کر بچوں کی طرح رونے لگے تھے۔

رفعت کی موت کے ایک ہفتہ بعد تک عظیم نے ٹھیلہ نہ نکالا۔ ایسا محسوس  
ہوتا تھا جیسے رفعت کی موت نے اسے توڑ دیا ہو۔ سمجھ سا گیا تھا بچا رہ رفعت  
اس کی بہن جو تھی۔

آٹھویں روز اس نے جا کر کہیں ٹھیلہ نکالا۔ بچا رہ دن بھر مزدوری کرتا رہا۔  
شام کے وقت جبکہ فضاؤں میں اندھیرا، دھند اور دھوئیں کی چادر پھیلنے لگی تھی۔  
وہ کسی کا سامان چھوڑ کر مسجد وزیر علی کے پاس سے گز رہا تھا۔ ایک دم مسجد کے لاؤڈ  
سیکریٹریز پر مغرب کی اذان سنائی دی۔ عظیم رک گیا اور بڑے غور سے اذان سننے  
لگا۔ مؤذن جب رک گیا تو عظیم نے ٹھیلہ شکر کھارے کھڑا کر دیا اور مسجد کی  
طرف بھاگا۔ مسجد کی چوکھٹ پکڑ کر اس کے ساتھ زور زور سے اپنا شکر اتارے  
ہوتے وہ چلا اٹھا۔

میرے خدا! میرے خالق و مالک! میں بھٹک گیا تھا۔ مجھے معاف کر دے

میرے اللہ۔ میں توبہ کرتا ہوں میرے اللہ میں توبہ کرتا ہوں۔ میرے خدا دنیا کے  
 غموں اور دکھوں میں میں بندہ نابکار اور رسوا اور وسیاہ تجھے فراموش کر گیا  
 تھا۔ تو ہر جگہ اور لا شریک ہے میرے خدا! جوتے اتار کر عظیم مسجد میں داخل ہوا  
 اور بلند آواز میں سبحان ربی لا علیٰ پکارتا ہوا وہ اس طرف بڑھا جہاں لوگ بیٹھے  
 وضو کر رہے تھے۔

---



En

کمال! تم یہاں؟

کمال! تم یہاں؟

کمل بوکھلا گئی اور بغلیں جھانکنے لگی تھی۔ وہ جوان اس کے پُرانے گاہکوں میں سے تھا اور جو کمل کو ساتھ لیجانے کے لیے بڑی بیتابی سے اس کا انتظار کیا کرتا تھا۔ شاید وہ کمل کو پسند کرتا تھا اس کا نام جہانگیر تھا جس لڑکی کی سالگرہ تھی اس نے فوراً اس جوان سے پوچھا لیا۔

بھیتا آسپ انہیں جانتے ہیں؟ وہ اس لڑکی کا بھائی تھا۔ وہ اور کمل اٹھا۔ جانا کیوں نہیں۔ یہ میرے دوست کی بہن ہے۔ اس نے فوراً کمل کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔ آؤ تمہیں امی سے ملاؤں۔ وہ مرد تمہیں یاد کرتی ہیں۔ کمل بچا دی مجھ وہی ہو گئی تھی۔ کیا کر سکتی تھی۔ وہ اسے کھینچتا ہوا اپنی ماں کے پاس لے گیا۔ امی! یہ ہے وہ کمل جس کی مجھے تلاش تھی۔

اس کی ماں کے چہرے پر رشتہ نشینت بکھر گئی۔ اور کمل کو پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔ بلٹیو بیٹی! جہانگیر تو تمہیں تلاش کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ میں جب بھی اس سے اس کی شادی کی بات کرتی تھی۔ تو کہتا تھا اگر شادی کرنی ہے تو کمل سے ورنہ نہیں میرے خیال میں تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو۔ جہانگیر کہہ رہا تھا تم نے اپنی پہلی رہائش تبدیل کر لی ہے۔ تم شاید بیبی کے سکول میں اتانی ہو۔

بڑی مشکل سے مردہ آواز میں کمل کہہ سکی۔

جی ہاں!



وہ اٹھ کھڑی ہوتی۔ تم دونوں اپنی شادی کے متعلق خود ہی طے کر تو م دونوں مل کر جو فیصلہ کرو گے مجھے منظور ہو گا۔ ایک بات کا خیال رکھنا بیٹی یہ میرا کیلا ہی اکیلا بیٹا ہے۔ اس کا دل نہ توڑنا۔ شادی کے لیے تمہاری جو بھی شرائط ہوں گی۔ ہمیں منظور ہیں۔ میں جہانگیر کے ابا کو اطلاع کرتی ہوں۔ وہ باہر نکل گئی۔

کمل تیزی سے اٹھی اور تیر کی طرح کمرے سے نکل گئی۔ جہانگیر نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن کمل نے اسے بُری طرح جھڑک دیا اور کوٹھی سے باہر نکل گئی۔ جب وہ ہوٹل آتی تو دوسری اُستانیوں اس کے متعلق کھسر بھسر اور چہ میگوئیاں کر رہی تھیں۔ اس سے کسی نے پوچھا تو کچھ نہ پریوں لگتا تھا انہیں کسی بات کی جستجو ضرور ہے۔

شام کے وقت جبکہ بے بی ہوٹل کے لان میں سکول کی دوسری بچیوں کے ساتھ پڑھ رہی تھی اور کمل اپنے کمرے میں کورس کی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی جہانگیر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ آتے ہی کمل کے ساتھ بستر پر بیٹھ گیا اور سلام بکتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

کمل نے فوراً اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ تڑپ کر وہ اٹھی اور بیڈ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے تہوہ تبار ہے تھے وہ کوئی بہت بڑا طوفان کھڑا کر دیگی۔ جہانگیر کمل کی اس حرکت پر نہس دیا۔

ایسی بھی کیا بے سُرخی ہوتی ؟  
کمل نے غصے میں کہا۔

تم یہاں کیوں آتے ہو؟  
تمہیں دیکھنے۔

یہاں سے چلے جاؤ۔

جہانگیر نے بڑی بے بسی سے کہا۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ وہ وقت یاد نہیں  
جب تم دن دن بھر میرے ساتھ رہا کرتی تھی۔

کھل پھلی ہو گئی۔ وہ کھل مر گئی ہے جو مجبور یوں تلے دبی ہوئی تھی۔  
میں اس کھل سے محبت کرتا ہوں۔ اور مجھے اس کی تلاش ہے۔  
جاؤ ڈھونڈتے پھر واسے

وہ تو میرے سامنے ہے اور میں اسے لینے آیا ہوں۔

کھل اور زیادہ سنجیدہ ہو گئی۔

میں کسی کے ساتھ نہیں جاؤنگی۔ صرف ایک شخص کے علاوہ میں دنیا کے  
سب مردوں سے نفرت کرتی ہوں۔

جہانگیر کی ہمت بندھی۔ کون ہے وہ؟

وہ ایسی ہستی ہے۔ جسے میں دل کی گہرائیوں سے پیاد کرتی ہوں۔ وہ میرے  
جیون کے آسمان پر ایک روشن ستارہ ہیں۔

جیانا نام ہے اس کا؟

ان کا نام غلیم ہے۔ وہ میرے جہنم جہنم کے ساتھی ہیں۔ میں نے مجبور یوں  
کے تحت عزت بیچی تھی۔ اس وقت وہ ذہنی شکستگی میں مبتلا تھے اور میری



کوئی مدد نہ کر سکتے تھے بلکہ انہیں میری محبت کی ضرورت تھی۔ میں اب بھی ان سے  
پریم کرتی ہوں۔ پر عزت بیچ چکنے کے بعد میں اپنے آپ کو اس قدر ہلکا اور نیچ  
سمجھتی ہوں کہ ان کے قابل نہیں رہی۔

جہانگیر سمجھ گیا۔ وہ کہاں رہتا ہے؟

یہیں اسی شہر میں۔

کیا کرتا ہے؟

معمولی مزدور ہے۔

جہانگیر سختی پر اتر آیا۔

تم اس سے محبت نہیں کر سکتی ہو۔ تمہیں میرے ساتھ سپنا ہوگا۔ میں  
تمہیں پیار کرتا ہوں۔ میں تم سے شادی کر کے تمہیں پرسکون زندگی بسر کرنے  
کے قابل بنانا چاہتا ہوں۔

کسی کے جذبات پر پہرہ نہیں بٹھایا جاسکتا تھا۔ میں تمہاری یہ پیش کش  
حقارت سے ٹھکراتی ہوں۔

جہانگیر اورد بڑھ گیا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور مکمل کا بازو پکڑتے ہوئے کہا،  
اٹھو! چلو میرے ساتھ!

پوری قوت کے ساتھ کل نے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا۔ اپنی حدود

میں رہو۔ کس بنا پر تم مجھے بار بار ہاتھ لگا رہے ہو۔

جہانگیر طیش میں آ گیا۔ تمہیں یہ طمانچہ مہنگا پڑے گا۔

تیز جنونوں سے گھورتے ہوئے کل نے کہا ۔

تو کیا اس دنیا میں صرف عورت کی عزت ہی سستی رہ گئی ہے ۔ جہاں گرنے  
دھمکی دی ۔ اب بھی وقت ہے ۔ میرے ساتھ چلو ۔ ورنہ یہاں تمہارا رہنا میں دوبھر  
کر دوں گا ۔

یہ زمین بہت وسیع ہے ۔

پر تمہارے لیے تنگ ہو جائے گی ۔

میں نے زندگی کا ایک تلخ دور دیکھا ہے ۔ مجھ پر ایسی باتوں کا اب کوئی اثر  
نہیں ۔ دوبارہ اگر میرے کمرے میں آئے تو مجھ اور تم دونوں میں سے پھر ایک ہی  
زندہ رہے گا ۔

جہاں گیر سور کی طرح نچھنے پھڑپھڑاتا باہر نکل گیا ۔ میں دیکھو ننگا تمہیں ؟  
کل دوسرے روز جب اسکول گئی ۔ تو ہیڈ مسٹریس نے اسے اپنے کمرے  
میں بلایا ۔ کل کو کچھ فکر دامنگیر ہوئی ۔ تاہم وہ اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی اندر  
جا کر ہیڈ مسٹریس کے سامنے بیٹھ گئی اور ہلکے سے پوچھا ۔  
مجھے آپ نے بلایا ہے ؟

ہیڈ مسٹریس نے غور سے اسے دیکھا ۔

ہاں ۔ تمہارا گھر کہاں ہے کل ؟

کل ماندھ پڑ گئی ۔ گھر تو میرا کہیں بھی نہیں ۔ مہاجر ہیں ۔ یہاں آکر مکان نصیب  
نہیں ہوا ۔ اب تک کراٹے کے مکانوں میں ہی رہتے آتے ہیں ۔



تمہارے ماں باپ ؟

مرچکے ہیں ؟

کوئی اور رشتہ دار

کھل کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔ کوئی نہیں ہے۔

عظیم کون ہے ؟

وہ میرے محسن ہیں۔

کیا اسکول کی زندگی سنے پہلے تم عزت بچتی رہی ہو ؟

کمل کا سر جھک گیا۔ بچاری اُلجھ جو گئی تھی۔

جھوٹ نہ کہنا۔

کمل نے اپنا سر اُپر اٹھا کر سر دمر دہ آواز میں کہا۔

جی ہاں — — — اس کی آواز حلق میں ڈوب گئی تھی۔

تو کیا تمہارے خیال میں ایک ایسی لڑکی جو خود اپنے ہاتھوں اپنے جسم کا

سودا کرتی رہی ہو۔ اسکول کی بچیوں کو رہبری کا سامان ہتیا کر سکتی ہے ؟

کمل نے سماجست کی۔

یہ سب کچھ مجبوریل کے تحت ہوا تھا۔ میرے ساتھ میری کمسن بہن اور

بیمار باپ نہ ہوتے تو میں عزت بیچنے پر موت کو ترجیح دیتی۔

پر میں نے تو اسکول کے ماحول کو دیکھنا ہے۔ اسکول کی ایک لڑکی کے

بھاتی نے مجھے تمہارے متعلق یہ اطلاعات دی ہیں۔ اس نے اپنا نام جہانگیر بتایا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر تمہیں یہاں سے نہ نکالا تو وہ اسکول کو بدنام کرنے کی مہم چلائے گا۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کر سکتی ہوں۔ مجبوراً مجھے تمہاری ٹرس ختم کرنا پڑی ہے۔

کمال نے روتے ہوئے کہا۔

تو کیا نیا کے ادیان، کائنات کے اخلاقی ضابطے اور انسانیت کی روایات یہی کہتی ہیں کہ راستہ جھٹکا ہوا ایک انسان اگر اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آجائے۔ گناہوں کی دہلیز پر پار کے سنہل جائے تو اسے بھرتا دیکھ کر اور گمراہی کی طرف دھکیل دیا جائے تاکہ اس کی ہستی ہی مٹ جائے اور انجام کار انسان ہی نہ بھلا سکے۔

ہیڈ مٹریس نے بیزاری سے کہا — یہ سب کتابی جملے ہیں۔  
کمال نے غصیلی آواز میں کہا۔

کتابی جملے نہیں۔ ایک بے بس اور مجبور عورت کی روداد ہے۔ اگر ایک عورت ہی حالات کی ستاتی ہوئی عورت کی مدد نہ کرے گی تو مرد تو کتوں کی طرح اس کا بدن اڑھیر کر رکھ دیں گے۔

میں مجبور ہوں تم اس اسکول نہیں پڑھا سکتی ہو۔

آپ کا آخری فیصلہ ہے ؟

بالکل ! اب تم جا سکتی ہو۔



کمل بانہر نکل گئی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ سر سے ڈو پٹہ ڈھک کر شانوں پر گر گیا تھا۔ وہ سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کچھ اتانیاں کلاسیں چھوڑ کر برآمدے میں کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔ ان کے پاس سے گزرتی ہوئی کھل شاف روم میں آئی اور ایک کمرہ پر گرتے ہوئے اس نے اپنا سر میز پر پھینک دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ایک ساتھی ٹیچر شاف روم میں آئی اور اس کا شانہ ہلاتے ہوئے بلایا۔

کمل ! کمل !

کمل نے چہرہ اُپر اٹھا۔ وہ رورہی تھی۔ شاید ماتم کمرہ ہی تھی۔ حالات کی تلخیوں اور بے رحم زمانے کے نادر واسلوک کا۔

کیا کہتی ہے ہیڈ مٹریس ؟

سروس سے نکال دیا ہے۔

کیوں ؟

بس اس دود میں ہر کوئی مجبور کی مجبور سی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ کمل کھڑی

ہو گئی اور اپنی ساتھی ٹیچر سے کہا۔

تم ایک بھلائی کر دو گی ساتھ

کہو ؟

میں یہاں سے ابھی جا رہی ہوں۔ سیبل یہیں رہے گی۔ میری تم سے التجا ہے

کہ تم اسے اپنے ساتھ رکھ لینا اور میرے بعد اس کا خیال بھی رکھنا۔

۲ اس کی ساختھی پگل گئی۔

تم فکر کیوں کرتی ہو۔ وہ میری بہن ہے۔ پر تم جاؤ گی کہاں  
کھل کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور چہرے پر سختی چھا گئی۔

حالات نے جس طرح مجھ سے انتقام لیا ہے اسی طرح میں بھی ان مردوں  
سے خوفناک انتقام لوں گی۔ میں نے اپنی زندگی کا انتہائی اور بھیانک فیصلہ کر  
لیا ہے۔ میں یہ ثابت کر دوں گی کہ عورت جب عورت پن کا لبادہ اتار پھینکتی  
ہے۔ تو سانپ سے زیادہ زہریلی اور طوفان سے زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے۔  
ساترہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

تم یہیں میرے ساتھ رہو۔

اول ہوں۔ میں نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر عمل کر کے رہوں گی۔  
سٹاف دوم سے نکل کر بڑی تیزی سے وہ ہوٹل کی طرف چلی گئی۔





اپنا اٹیچی اٹھاتے کھل ہوٹل سے نکلی۔ جو نہی وہ سڑک پر آئی سامنے نیلے  
دنگ کی ایک کاکھڑی تھی اور اس میں جہانگیر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ کل جب اس کے  
پاس سے گزرنے لگی تو اس نے دروازہ کھول دیا۔

آؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔

زخمی آواز میں کھل نے پوچھا۔

مجھے یہاں سے نکال کر تمہیں کیا ملا؟

میں نے تمہیں اس خیال کے تحت یہاں سے نکلوا یا ہے کہ تم میرے ساتھ

جانے پر مجبور ہو جاؤ۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ میں اس وقت بھی تمہارے  
ساتھ جانے پر رضامند نہ ہوں گی۔ جب میرے سر پر موت کھڑی ہو۔

جہانگیر باہر نکلا اور دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔  
 اچھا میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔ اب تو چلو میرے ساتھ گھر  
 میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔

کسی کا دل دکھانا۔ اچھی بات تو نہیں  
 میرا دل نہیں دکھایا گیا؟

کھل آگے بڑھ گئی۔ جہانگیر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ تھوڑی دُور جا کر اس  
 نے رکشہ کر لیا۔ جہانگیر پھر بھی اس کے تعاقب میں تھا۔ کھل اسی عمارت کے  
 سامنے رکی جس میں ڈور تھی اپنا کاروبار چلاتی تھی اور جو کبھی اس کی دلالہ تھی۔  
 جہانگیر وہاں سے لوٹ گیا۔

کھل دوسری منزل پر ڈور تھی کے آفس میں داخل ہوئی۔ وہ اپنے سامنے  
 کاغذ پھیلاتے بیٹھی تھی اور سگریٹ پھونک رہی تھی۔ کھل کو دیکھتے  
 ہی وہ پھول کی طرح کھل گئی اور کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔

بہت عرصے بعد آئی ہو۔ میں نے تو سنا تھا تم شریفوں کی بستی میں جا چکی  
 ہو۔ ملنے آئی ہو؟ یا ————— کھل نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

پناہ لینے آئی ہوں خانم!

پناہ اور یہاں؟

ہاں خانم! خدا کی اس بستی کے شرفاء کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر  
 میں یہاں تمہارے پاس پناہ لینے آگئی ہوں۔ میں جانتی ہوں۔ تم لوگ یہاں



لڑکیاں خرید کر لاتے ہو جبکہ میں انہیں خود آگئی ہوں اور اس طرح ہاتھ لگی  
ہوتی چیز کی قیمت گر جاتی ہے۔  
ڈورہ تھی نے ایک وقار سے کہا۔

تم نے غلط سوچا ہے۔ یہاں کی ہر چیز کو حسن کے معیار پر پرکھا جاتا ہے۔  
تمہارا حسن غیر یقینی حد تک معیار ہی ہے۔ بیٹھو تم کھڑی کیوں ہو۔ میں نے سنا  
ہے۔ تمہارا باپ مر گیا ہے۔

اچھی ایک طرف رکھ کر کھل بیٹھ گئی۔

ہاں میرا مجبور اور بے بس باپ مر گیا ہے۔  
پھر تم اور زیادہ لگن سے یہاں کام کر سکو گی۔

خانم! مجھے اس سندسار کے مردوں سے انتقام لینا ہے۔ جو عورت کو  
کھلونا جان کر اس سے کھیلتے ہیں۔ میں اب یہاں عزت نہ بیچوں گی خانم کوئی  
اور کام دو مجھے۔

خانم نے اس کی تائید کی۔

کون کہتا ہے تم عزت بیچو۔ تمہارے جیسی حسین لڑکی کے لیے بہت کام  
ہیں۔ رقص کی تربیت شروع کر دو۔ ایک روز میں تمہیں فلم انڈسٹری کی اول صف  
کی مقاصد بنا دوں گی۔ اس کے علاوہ چند ہی دنوں میں تجھے میں ماڈل گرل بنا  
دوں گی۔ میرے پاس کئی کمپنیوں کے ڈھیروں خط آتے ہوتے ہیں وہ  
حسین سے حسین تر ماڈل گرلز مانگتے ہیں اور تم سب کے لیے فٹ ہو۔ اس لائق

سے بھی تم بہت کچھ کھا سکتی ہو۔

ایک اور بات بتاؤ خانم !  
کہو ؟

اس بازار سے باہر عورت عورت کہلاتی ہے۔ پر یہاں آجانے کے بعد  
زندگی اور طوائف کیوں کہلاتی ہے۔  
خانم نے چونک کر کہا۔

واہ بیٹی ! یہ بھی تم نے خوب کہی۔ تم تو جانتی ہوں۔ ہم لڑکیوں کو پتھروں  
کے روپ میں یہاں لاتے ہیں۔ ان پتھروں کی تراش تراش کے بعد ان میں سے  
ہم نایاب موتی نکالتے ہیں اور جب اس موتی کو سجا کر ہم دنیا والوں کے سامنے  
پیش کرتے ہیں تو یہ پاگل لوگ اس کا نام زندگی رکھ دیتے ہیں۔

ڈور تھی نے گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا۔ تھرڈ کلاس اور کنڈم سے چہرے  
والا ایک جوان دروازے پر اکھڑا ہوا۔ شاید چپڑا اسی ہوگا۔ ڈور تھی نے اسے کہا۔  
ذرا استاد جی کو بلاؤ۔

تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا آفس میں داخل ہوا۔ ڈور تھی نے اس  
سے کہا۔

استاد جی ! یہ نئی بچی آئی ہے۔ یہ میری عزیزہ ہے۔ رقص کی تربیت کیلئے  
اسے میں آپ کے حوالے کرتی ہوں۔ ایسی محنت کریں اس پر کہ دھوم مچ جائے  
اس کی شہر میں۔ ماڈل گریڈ کے لیے ہمارے پاس جو ضروریات آئی ہیں اس



کے لیے بھی سب کمپنیوں کو اسے ہی دکھانا ہے۔

استاد جی نے اپنی سفید مونچھیں درست کیں۔

دیکھنا خانم اسے کندن بنا دیں گے ہم

اسے اسی منزل کا کونے والا کمرہ دے دو۔ ادھر کسی کا زیادہ آنا جانا نہیں

ہے۔ کوئی اسے اس کی مرضی کے خلاف عزت بیچنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اس  
استاد نے کھل سے کہا۔

اٹھو میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں۔ کھل اٹھ کر اس کے ساتھ ہولی۔

کھل نے چھ ماہ تک دن رات ایک کر کے رقص کی تربیت حاصل کی اس  
عرصہ میں وہ ٹی وی اشتہاری فلموں میں بطور ماڈل گرل کام کر کے کافی شہرت حاصل  
کر چکی تھی اور اس کے ذریعے سے ڈور تھی ہزاروں روپے کمانے لگی تھی۔ اس  
دوران جہانگیر اور اس کے دوسرے پرانے گاہک کئی بار اس کے پاس آئے،  
پراس کے کہنے پر ڈور تھی انہیں یہ کہہ ٹال دیتی تھی کہ وہ کسی اشتہاری فلم کی  
شوٹنگ پر گئی ہوتی ہے۔ اصل میں وہ ایک مقام حاصل کر کے اپنے انتقام  
کی ابتدا کرنا چاہتی تھی۔

رقص کی تعلیم مکمل کر کے ڈور تھی اسے فلموں میں بطور رقاصہ لے آتی تھی۔  
ایک تو حسین تھی، جسم میں سیکس اپیل بھی بہت زیادہ تھی اور اس پر طرہ رقص  
میں اس کی مہارت جلد ہی وہ لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بکھیر دے گئی تھی۔ ہاں  
ڈور تھی نے اسے ایک نئی اور انتہائی قبیح عادت ڈال دی تھی۔ وہ دن رات

حد سے زیادہ سگریٹ اور شراب پینے لگی تھی۔ اور کھانسی کی مریض ہو کر رہ گئی تھی اس کا کمرہ اب خوب سجا دیا گیا تھا۔ جس کے باہر ہر وقت ایک ملازم بیٹھی رہتی۔ عمارت اور عمارت سے باہر دو دلال اس کی حفاظت کے لیے ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے تھے جو اس کے باڈی گارڈ کے فرائض انجام دیتے۔

اب وہ اپنے ماحول کی آپ مالک تھی۔  
رہبر تھی اپنے منزل کی طرف جانے والے کاروان کی۔  
وہ شعلہ تھی۔

بجلی تھی۔ جو کو نندی اور عاشائی دل تھام کر رہ جاتے۔  
ایک روز جہانگیر نے ڈور تھی سے فون پر کمر کا پوچھا۔ کمر بھی اس وقت ڈور تھی کے ساتھ آفس میں بیٹھی تھی۔ ڈور تھی نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کمر سے پوچھا جہانگیر کا فون ہے کیا کہوں۔

کمر کا چہرہ غصے میں سُرخ ہو گیا۔ اسے کہوا جائے پردس ہزار سے کم رقم میں کمر تمہیں نہ بٹھائے گی۔ ڈور تھی نے فون پر جس طرح کمر نے کہاں تھا ویسے ہی کہہ دیا اور رسیور رکھ دیا۔ کمر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جہانگیر کی کار عمارت کے باہر کی اور وہ سیڑھیاں چڑھ کر ڈور تھی کے آفس میں آیا۔ ڈور تھی نے اسے کمر کا کمرہ نمبر بتایا اور گیلری میں کھڑی ہو کر تماشا دیکھنے لگی۔ جہانگیر کمر کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنے پلنگ پر نیم دراز تھی۔ اس کے سامنے ایئر ٹریٹنگ سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی



تھی اور ایک طرف چھوٹی پتائی پر شراب کی بوتل اور جام بڑا تھا۔ سگریٹ کا ایک لمبا کش لیکر کل نے شراب کا ایک گلاس پیا۔ تھوڑی دیر تک کھانسی رہی پھر جہانگیر سے پوچھا۔

کدھر آئے ہو؟

جہانگیر بڑا مرعوب دکھائی دے رہا تھا۔ ایک تو کل کے کمرے کی سچ دھج ہی ایسی تھی۔ دوسرے کل کی صحت اب پہلے سے کئی گنا اچھی تھی جس کے سبب وہ اور زیادہ حسین ہو گئی تھی اس کی شخصیت ایسی نکری تھی کہ دیکھنے والا دیکھتا رہ جاتا تھا۔ کچھ کچھ سے لہجے میں جہانگیر نے کہا۔

ڈوڈ تھی سے تمہارے متعلق پوچھا تو اس نے کہا آج او دس ہزار میں کام ہو جائے گا۔ اس لیے چلا آیا ہوں۔ کل اٹھی۔ بوتل سے جام میں شراب انڈھیلی اور ہلکی ہلکی چکیوں میں شراب پیتے ہوئے کہا۔

رقم؟

جہانگیر نے دس ہزار کی رقم نکال کر کل کے سامنے پتائی پر رکھ دی۔ کل نے نوٹ سنبھالے اور تالی بجاتی۔ دوپٹے کٹے مرد گمرے میں داخل ہوئے۔ کل نے کسی شہزادی کی طرح ان سے کہا۔

ذرا ان صاحب کی خاطر ہو جائے۔ وہ پھر بڑی طرح کھانسنے لگی تھی۔ وہ دونوں آگے بڑھے۔ اور جہانگیر کو بکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ دونوں نے خوب اچھی طرح جہانگیر کی مرمت کی اور دھکے دے کر عمارت سے باہر پھینک دیا

ایک روز بخشو بھی اس عمارت میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کمل کی تصویر تھی۔ کسی فلم کا پوسٹر تھا۔ جسے وہ بازار سے خرید کر لایا تھا۔ وہ سیدھا ڈور تھی کے کمرے میں گیا اور کمل کی تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا۔

یہ مقاصد یہیں ہے نا !  
ڈور تھی نے تصویر دیکھتے ہوئے کہا

یہیں ہے۔۔۔

کون سے کمرے میں

بارہ نمبر میں

کیا میں اس کمرے میں جا سکتا ہوں۔

وہ کسی کو بٹھاتی نہیں۔

ایک ہزار دو لاکھ۔

نہیں مانے گی۔

پانچ ہزار

مشکل۔

دس ہزار

ایک لاکھ بھی دو تو نہ مانے۔

بخشو کھڑا ہو گیا۔ تم مجھے اس کے کمرے میں تو جانے دو۔ میں اس کا پرانا  
جاننے والا ہوں۔ دس بیس ہزار میں مان نہ گئی تو بخشو نام نہیں۔



اگر پرانے گا ہک ہو تو بیشک چلے جاؤ۔  
بخشوں نے جب کمل کے کمرے میں داخل ہونا چاہا۔ تو باہر بیٹھی ہوئی عورت  
نے اسے روکا۔

بی بی کا حکم ہے اندر کوئی نہ جاتے۔  
بخشوں نے اس عورت کو زبردستی ایک طرف ہٹا کر کہا۔ تم فکر نہ کرو۔ وہ  
ناراض نہ ہوگی۔ میری اس کی جان پہچان ہے۔ بخشو کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر  
کمل پلنگ پر لیٹی آرام کر رہی تھی۔ اس عورت اور بخشو میں تکرار کے باعث وہ  
جاگ گئی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں ایک خمار تھا۔ ملازمہ  
نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

بی بی! میں نے اسے منع کیا۔ پر یہ زبردستی اندر آ گیا ہے۔  
کمل سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اپنا لباس درست کیا اور پھر بخشو کی طرف دیکھ کر  
سکراتے ہوئے اس نے پوچھا۔  
بیٹھ جاؤ کھڑے کیوں ہو۔

بخشو فوراً کمل کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمل نے بڑے پیار سے اسے  
مخاطب کیا کہاں رہے اتنا عرصہ۔ میں تم سے اپنے رویے پر نادم ہوں۔  
بخشو کھل اٹھا۔ کوئی بات نہیں۔ صبح کا بھولا ہوا شام گھر آ جائے تو عرج  
ہی کیا کہاں چلے گئے تھے۔

کراچی رہا ہوں۔ وہاں جوئے میں خوب کمایا۔ اس نے جیب میں

ہاتھ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

کیا پیش کروں۔

کمل نے یگرٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

کم از کم دس ہزار۔ اس سے زیادہ تمہاری اپنی مرضی۔

بخشوں نے نوٹ نکال کر اس کی گود میں رکھ دیتے۔ کمل نے تالی بجاتی اور

اس کے دونوں باڈی گارڈ کمرے میں داخل ہوتے۔ کمل نے انہیں اشارہ کیا

اور وہ دونوں بخشو پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے بخشو کو مار مار کر فرش پر گرا دیا۔

کمل اٹھی اور اور بخشو کے قریب جا کر طنزاً پوچھا۔

کچھ ہوش ٹھکانے آئے ہیں۔

بخشوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

کمل نے پھر اس کی مرمت کرنے کو کہا۔ اور بخشو کی پھر پاتی شروع ہو گئی۔

کمل نے دوبارہ اپنے آدمیوں کو روکا اور بخشو سے پوچھا۔

ذہن ٹھکانے لگا ہے؟

بخشوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کمل زور سے چلاتی۔ اسے اٹھا کر عمارت سے

باہر پھینک دو اور تبادو۔ دوبارہ اگر ادھر کا دُخ کیا۔ تو اس سے بھی بدتر حالت

بنے گی۔

کمل اب اپنے سب پرانے گاہکوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنے لگی تھی۔

کیکن افسوس وہ دن رات شراب اور سگریٹ پیتی رہتی تھی اور اندہ سے کھوکھلی

ہوتی جا رہی تھی۔





غلیم اپنے اڈے میں مزدوری کے انتظار میں اپنے ٹھیلے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اس کا کتا اس کے قریب آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ اتنے میں ایک طرف سے بچشوا اور اس کا ایک بد معاش ساتھی آتے۔ بچشوا نے غلیم کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھی سے کہا۔

یہ ہے وہ غلیم جس نے اس کمل کی خاطر مجھے بے عزت کر کے نکالا تھا۔ پھر اس نے غلیم کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

جاسنٹے ہو وہ آجکل کہاں ہے۔ وہ آجکل فلموں میں رقاصہ کے طور پر آ رہی ہے ٹی۔ وی کی اشتهاری فلموں میں ماڈل گرل کے طور پر آ رہی تھی۔ ذلیل انسان وہ لڑکی جس کی خاطر تم نے مجھے ذلیل کیا تھا وہ آجکل طوائف ہے۔ اور اپنی اسی دلالہ

ڈور تھی کی عمارت کے بارہ نمبر کمرے میں رہتی تھی۔ وہی ڈور تھی جو کبھی اس کے لیے گاہک مہیا کرتی تھی۔

غظیم کھڑا ہو گیا اور غصے میں لرزے ہوتے کہا۔

تم بکتے ہو۔ وہ طوائف نہیں ہو سکتی۔

غظیم کے اٹھنے پر کتابھی انگڑائی لیتا ہوا کھڑا ہو گیا اور بخشتا اور اس کے ساتھی دونوں کو گھورنے لگا تھا۔

بخش نے چبھتے لہجے میں کہا۔

تم نے اس کل کی خاطر میری بے عزتی کی تھی آج میں تم سے اس کا بدلہ لوں گا۔  
غظیم نے آئینیں چڑھالیں۔ پہلے والی مار کے نشانات شاید مٹ گئے ہونگے؟  
بخش کا ساتھی چلا کر بولا۔

اے یہ دو ملے کامزدور اور اس تندہ منہ بھر کے باتیں کر رہا ہے۔ ذرا

بھاؤں نہ اسے دو ہاتھ سارا بھرم کھل جائے گا اس کی بد معاشی کا۔

وہ دونوں غظیم کی طرف بڑھے۔ غظیم بھی تیار ہو گیا تھا اور کتابھی لہجے میں غرا نے لگا تھا۔ بخش نے آگے بڑھ کر غظیم کو مکا دے مارا۔ غظیم جھک کر اپنا آپ بچا گیا اور پھر اوپر اٹھتے ہوئے ایک سخت مکہ بخش کے پیٹ میں جمادیا۔

بخش کا ساتھی جب غظیم کو مارنے لگا تو کتابھی مار کر آگے بڑھا اور اس کی

ٹانگ منہ میں لے کر جہانے لگا۔ وہ درد کی شدت سے کراہ اٹھا تھا۔ اتنی دیر تک

غظیم نے بخش کو مار مار کر نہ حال کر دیا تھا۔



عظیم نے اپنے کتے کو جھڑک کر پیچھے ہٹایا۔ اس نے بخٹو کے ساتھی کی ٹانگ چبادی تھی اور خون بہنے لگا تھا۔ بخٹو خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اپنے ساتھی کو لیکر وہ وہاں سے کھسکا اور اسے رکشے میں بٹھا کر وہاں سے لے گیا۔

بخٹو سے کھل کے متعلق سن کر عظیم کے جسم میں آگ لگ گئی تھی اور ریڑھا کھینچتا ہوا وہ اپنے اڈے سے نکل کھڑا ہوا۔ ڈور تھی کی عمارت کے باہر عظیم نے اپنا ٹھیلہ کھڑا کیا اور سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر آیا۔ کندھے سے اپنی پھٹی ہوئی قمیض درست کرتا ہوا وہ ڈور تھی کے آفس کے سامنے سے گزرا اور بارہ نمبر کمرے کے سامنے آگیا۔ وہاں دروازے کے قریب کرسی پر ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ عظیم نے اس عورت سے پوچھا۔

کیا کھل کا کمرہ یہی ہے۔

اس عورت نے بیزاری میں کہا۔ یہی ہے پر تمہیں کیا۔  
میں نے اسے ملنا ہے۔

ہوش میں تو ہوتا ؟

ہوش میں نہ ہوتا۔ تو یہاں تک کیسے پہنچ جاتا۔

وہ کسی سے نہیں ملتی۔ جاؤ چلے جاؤ۔

تم میرا بتاؤ تو یہی وہ ضرور مجھے اندر بلا لگی۔

کیا کہوں اسے ؟

کہنا عظیم ملنا چاہتا ہے۔

ملازمہ اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوٹی اور عظیم سے کہا اندر چلے جاؤ  
بی بی تمہیں بلاتی ہیں۔

عظیم اندر داخل ہوا۔ کمر ایک صوفے پر دھنسی بیٹھی تھی وہ سگریٹ پر  
سگریٹ پی رہی تھی اور شراب کی بوتل اس کے سامنے پیانی پر پڑی تھی شراب  
کے خالی پیالے سے ظاہر ہوتا تھا کہ عظیم کے آنے سے قبل کمر اپنے کمرے  
میں بیٹھ کر شراب پی رہی تھی۔

کمر سے ہٹ کر عظیم ایک ساگوانی صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ  
کمر کو غور سے دیکھتا رہا جس سے یوں لگ رہی تھی جیسے کوئی تیکھے جوتوں والی  
کوئی حسین دیوا سی۔ اس کی صحت پہلے سے بہت اچھی تھی اور خوبصورت چہرہ  
پکے ہوئے انسان جیسا ہوتا تھا۔ وہ اور زیادہ حسین ہو گئی تھی۔ باغ عدن کے  
چمکنے پتوں کی طرح دینس کی حسین دیوی کی طرح۔ پھر عظیم کی نگاہیں جھک گئیں اور  
وہ اپنی پھٹی ہوئی قمیض چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگا تھا۔ کمر پر کھانسی کا ایسا  
دورہ پڑا کہ وہ کھانسی کھانسی کر مڑھا ہوا ہو گیا۔ اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی۔  
جیسے اس کی چھاتی پھٹ جانے لگی۔ بڑی مشکل سے کمر نے کافی دیر بعد اپنے  
آپ کو سنبھالا اور عظیم کی طرف دیکھا۔ جو اس کے سامنے مہاگنی کے کسی قدیم اور  
سیاہ درخت کی طرح ادا اس بیٹھا تھا جیسے پرانی یادوں کے سمندر میں دفن ہو  
گیا ہو۔ تحلیل شدہ مسکراہٹ اور دبے لہجے میں کمر نے عظیم کو مخاطب کیا۔  
کہہ رہے ہیں آپ ؟



عظیم نے سر اُپر اٹھایا۔

ا ف ۔

اس کے چہرے پر ہزاروں حسرتیں اور مایوسیاں بکھری ہوئی تھیں۔ تھوک نکلنے ہونے وہ درد بھرے لہجے میں یوں بولا جیسے ہتھیار بالسر یاں رات کے وقت مامی گیت گارہی ہوں۔ بکل نے اُس کی آواز سُنی جس میں کرب و درد تھا۔ میرا ایک ساتھی کھو گیا تھا۔ اس کی تلاش میں نکلا ہوں۔ شاید یہاں مل جاتے۔ بکل نے پھٹے پھٹے، آزدہ اور زخمی لہجے میں کہا۔

یہاں آکر تو لوگ اپنا سب کچھ کھو بیٹھتے ہیں۔ یہاں کسی کو کیلے گا۔ لمحہ بھر کے لیے عظیم پر ایک شہوری کیفیت سی چھا گئی۔ پھر وہ اپنے بے کل باطن کی گہرائیوں سے بولا۔

جس کے پاس کچھ ہو ہی نا۔ وہ کیا کھوئے گا۔

اپنی پراسرار گرم آنکھیں عظیم کی آنکھوں میں ڈالتے ہوئے بکل نے ملائم آواز

میں کہا —

عزت !

عزت ؟ — ہوں — عزت تو لوگ یہاں خشک

پتے کی طرح ہوا میں اچھالتے پھرتے ہیں۔

بکل کی دراز پلکیں جھک گئیں۔ اس کے کانوں میں لٹکتے ہوئے نیلے آویزے آہستہ آہستہ ایک خوش کن تال کے ساتھ ہل رہے تھے۔ پھر

اس کی روتی ہوئی آواز سنائی دی۔

مگر ایسے بازادوں میں عزت بکتی ہے۔

عظیم کے چہرے پر کئی جنگلی سے رنگ بکھر گئے۔ افسوس بھرے انداز میں اس نے کہا۔

دنیا کی ہر چیز بکتی ہے۔

عزت بکتی ہے۔

خلوص بکتا ہے۔

انسان بکتا ہے۔

ایمان بکتا ہے۔

ہر چیز بکتی ہے۔ کیا نہیں بکتا؟

لاٹچ کی آڑھ میں بھاتی بک جاتے ہیں۔

ممتا کے ہاتھوں ماں اور خلوص کے ہاتھوں بہن بک جاتی ہے۔

عظیم کی آواز اور زہریلی ہو گئی جیسے اس کے پندار پر کسی نے ٹھوکر مار دی ہو۔

لوگ — انسانیت کے یہ ٹھیکیدار — مطلب پرست یہ بھیڑیے  
اُس کی آواز اٹک رہی تھی۔ شاید غصے کے باعث — یہ — یہ لوگ۔

عورت کو ماں، بہن اور بیوی کہتے ہیں مگر —

مگر اسی ماں، بہن اور بیوی کو جب وہ غلط راستے پر ڈالتے ہیں تو یہ



ظالم لوگ اس کا نام بھی بدل دیتے ہیں اسے عورت نہیں رہنے دیتے ۔  
 کل روپڑی تھی اور منہ دوسری طرف کر کے رومال سے اپنے آنسو صاف  
 کرنے لگی تھی ۔ عظیم کی خواب انگیز آواز پھر سنائی دی ۔  
 میرا ایک ساتھی مجبوریوں کے ہاتھوں بک گیا تھا ۔ میں جھڑے ہوتے  
 خشک پتے کی طرح دھکے کھاتے ہوتے اسے تلاش کر رہا ہوں ۔  
 کل نے نظر بھر کر عظیم کو دیکھا ۔ پھر پست و مضمل آواز میں کہا ۔ جس کی  
 عزت بک گئی ہو اس کی کیا قدر ؟  
 عزت بک گئی تو کیا ہوا ۔ یہاں تو لوگ خدا کو بیچ کر بھی اپنا مطلب پورا  
 کر لیتے ہیں ۔ کلرک اپنی تعلیم بیچتا ہے اور پیٹ کا دودھ بخرتا ہے ۔  
 عالم اپنا علم اور مزدور اپنی محنت بیچتے ہیں ۔  
 ایک بے بس اور مجبور لڑکی نے جس کے پاس کچھ نہ رہا تھا ۔ اپنی کم مائیگی  
 اور بے زری کی حالت میں اگر اپنا گوہر عصمت بیچ ڈالا تو کون سا ستم ٹوٹ  
 پڑا ہے ۔

کل روپڑی ۔

آپ جسے تلاش کرتے پھرتے ہیں وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے ۔  
 عظیم نے آہستگی اور ٹھہراؤ میں کہا ۔  
 یہیں ہے ۔ مگر بھٹک گیا ہے ۔ اسے ضرورت ہے ۔  
 ایک رہبر کی

ایک ساتھی کی

ایک غم گسار کی

ایک ہمدرد اور سہارا دینے والے کی جو اس کا ہاتھ پکڑ کر سیدھے رستے پر ڈال دے اور اپنے ساتھ اپنی منزل کی طرف لے جاتے۔

بھٹکے ہوئے بھی کبھی لوٹے ہیں؟

زندگی کی راہ گزر پر ہر کوئی بھٹکتا ہے اور سنبھل جاتا ہے۔

کمل نے بالوسی میں کہا۔

دل ایک شیشہ تھا۔ ایک نامکمل خواب تھا جو ٹوٹ گیا۔ اب کون اسے جوڑے گا۔ عظیم نے بڑے اعتماد اور اشتیاق سے جواب دیا۔ شیشہ اور نامکمل خواب تو کیا۔ ٹوٹے ہوئے دل جوڑ جاتے ہیں۔

بہر حال یہاں ایسا کوئی نہیں جسے آپ اپنا ساتھی کہہ سکیں۔  
عظیم سمجھ سا گیا۔

ہمت ہارنا انسان کا شیوہ نہیں میں کسی کے زخموں پر مرہم رکھتا رہوں گا۔ اگر دوا میں اثر اور میری دعاؤں میں خلوص ہو تو مجھے بالوسی نہ ہوگی۔

کچھ زخم ناسور بن کر لا علاج ہو جاتے ہیں۔

ان کا بھی کوئی علاج ضرور ہوگا۔

کمل نے اس بار بڑے پیار سے کہا۔

آپ یہاں نہ آیا کریں۔ بدنام ہو جائیں گے۔



غلیم کی آنکھیں غصے میں اُبل پڑیں۔ ان نفس پرست دنیا والوں نے اتنے دکھ دیئے ہیں۔ سمجھو نگا ایک اورو ہی۔ اس کے بعد بھی اگر تم میرے ساتھ چلی جاؤ۔ تو میں سمجھو نگا۔ میں نے کچھ نہیں کھویا۔

میں اب اس دنیا میں واپس نہ جاؤنگی۔ جہاں قدم قدم دھوکا اور سانس سانس فریب ہے۔

خلاؤں میں گھورتے ہوتے غلیم نے کہا۔

وہ میرا ساتھی ہے جو مٹی میں مل گیا ہے۔

ایک موتی ہے جو سمندر میں گر گیا ہے۔

لوگوں نے اسے طوفان میں دھکیل دیا ہے۔

جلتی ہوئی اور بجھتی چٹا میں ڈال دیا ہے۔

میں اک بندہ نابکار ہی ہوں۔ پر قسم خدا پاک کی میں اسے ڈھونڈتا رہوں گا۔

اس کے سامنے اپنے دل کا گیت گاتا رہوں گا۔ میرا اس کا ایک غیر مرتی بندھن ہے

ایک روز وہ اپنے سارے شہابی رنگوں اور میٹھی تڑپ کے ساتھ مجھے ضرور اپنا کہہ

پکارے گی اور وہ دن اس کی کٹھن زندگی کا آخری دن ہوگا۔ کل نے دیکھا غلیم کے

چہرے پر نا اُمیدیاں سی گہری ہو گئی تھیں۔ ایک حسرت بھری نگاہ اس نے کل پر

ڈالی۔ پھر وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

کل بچا ہی اسے دیکھتی رہی۔

کے پھٹے ہوتے کپڑے۔

پہلے سے مکر و دھرم

لڑکھڑاتی چال

میلوس چہرہ

اور بھیگی بھیگی آنکھیں دیکھ کر دل و پڑی - ایک بارے ہوئے جواہری ، تھکے  
ہوئے مسافر اور کچلے ہوئے انسان کی طرح غلیم جب باہر نکل گیا - تو کھل اپنے پلنگ  
پر گر گئی اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی - ملازمہ بچاری اندر آئی تھی - پر اسے روتا دیکھ  
کر افسردہ چہرہ لیے باہر نکل گئی -

---





عظیم اب شاموں اور آفتاب کی طرف سے کچھ بنے فکر ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ آفتاب میٹرک کر کے ایک ڈسٹری بیوٹر کے ہاں سیلزمین ہو گیا تھا۔ اور اب وہ اس قابل تھا کہ گھر کے اخراجات چلا سکے۔ چار روز باہر رہنے کے بعد جب عظیم گھر لوٹا اور ٹھیلہ اٹھاس تیلے کھڑا کر کے جب وہ کمرے کی طرف جانے لگا تو اس نے دیکھا کہ کمرے سے باہر سفید رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔ وہ کچھ ٹھٹھکا تا، ہم کمرے میں داخل ہوا۔

اندر شامو کے پاس آسیہ بیٹھی ہوتی تھی۔ آفتاب شاید ابھی تک اپنی ڈیوٹی سے نہ لوٹا تھا۔ عظیم کو دیکھتے ہی آسیہ کھڑی ہو گئی اور اس کی طرف بڑھی۔ عظیم نے پہلے ہی پوچھ لیا۔

کیسی ہو اسی!

آسیہ نے آگے بڑھ کر پیار سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

میں ٹھیک ہوں۔ آپ میرے ساتھ گھر چلتے۔

عظیم جھٹکنے لگا۔ میرا کوئی گھر نہیں۔

آسیہ رو پڑنے والی تھی۔ وہ گھر کس کا ہے۔ جہاں آپ نے بچپن گزارا۔ اور

جہاں امی اور بہنوں کے ساتھ آپ ایک مثالی زندگی بسر کر رہے تھے۔

میں اب اس گھر کی دھلیزن نہ جھانگوں گا۔

آسیہ بچاوی کھل کر رو دی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے

عظیم کے بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

میں کہتی ہوں میرے ساتھ چلتے۔ قیصر نے خودکشی کر لی ہے۔ میں اور بونے

پچھلے دو دن سے آپ کو بہت ڈھونڈا لیکن آپ نہیں ملے۔ قیصر جیسا تھا۔ آخر

آپ کا بھائی تھا۔ اب بھی میرے ساتھ آنے لگے تھے چمڑک گئے۔ کہتے تھے تم

اکیلی جاؤ شاید میرے ساتھ جانے سے وہ نہ آئے۔ وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ آپ

ان سے نفرت کرتے ہیں۔

عظیم کی آواز کہیں دور سے سنائی دی۔

قیصر نے خودکشی کر لی؟

ہاں!

کب؟



تین روز ہو گئے ہیں۔ ابو نے اس کی جان بچانے کی کوشش کی پر کامیاب نہ ہو سکے۔ اس نے کچھ کھا لیا تھا اور اپنے کمرے میں پڑا رہا تھا۔ ہمیں بہت بعد میں خبر ہوئی وہ بھی اس وقت جب میں آپ کے گھر کی صفائی کرنے گئی۔ اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ اور قیصر بیچ نہ سکا۔ عاصفہ نے زبردستی اس سے طلاق لے لی تھی نا۔ کچھ روز تک وہ بھاگ دوڑ کرتا رہا کہ اس سے صلح ہو جائے پر عاصفہ نہ مانی اور اس نے خودکشی کر لی۔

کیا وہ مر گیا ہے۔

ہاں وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے دوٹھ چکا ہے۔ چلتے میرے ساتھ۔

میں اب وہاں جا کر کیا کرونگا؟

آسیہ اسے زبردستی کھینچتی ہوتی باہر لاتی۔ میں کہتی ہوں میرے ساتھ چلتے۔ غطیم نے کوئی اعتراض نہ کیا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ آسیہ نے اسے اپنی کار میں اگلی سیٹ پر اپنے ساتھ بٹھایا اور کار عمارت سے باہر نکل گئی۔ آسیہ غطیم کو اپنے گھر لیجانے کے بجائے غطیم کے اپنے گھر لے گئی۔ آسیہ نے گھر کو پہلے جیسا صاف ستھرا دکھا تھا ہر چیز اسی طرح قرینے سے دکھی تھی جس طرح اس کی امی دکھا کرتی تھی۔ آسیہ نے پہلے سارا گھر غطیم کو دکھایا پھر مسکراتے ہوتے پوچھا۔

وہی گھر ہے نا۔

غطیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ آسیہ ایک بڑا تولیہ اور صابن دانی نکال لانی

اور عظیم کا ہاتھ پکڑ کر غسل خانے کی طرف لیجاتے ہوئے کہا۔

پہلے نہالیں۔ یہ پُرانے کپڑے نہ پہنیں۔ اب میں آپ کے دوسرے کپڑے نکالتی ہوں۔ عظیم آسیہ کے سامنے بول نہ رہا تھا۔ بالکل کسی اچھے اور فرمانبردار معصوم بچے کی طرح وہ تولیہ اور صابن لیکر غسل خانے چلا گیا۔ وہ جب نہار ہاتھ اتار دوازدہ پر دکھے ہوئے اس کے پُرانے کپڑے آسیہ نے اٹھالیے اور ان کی جگہ نئے کپڑے رکھ دیئے۔

عظیم نے باہر آکر بال بناتے پھر آسیہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر کی طرف لیجاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

چلئے ابو کے پاس وہ ہمارا انتظار کر رہے ہونگے۔

سعادت اپنے کمرے میں بیٹھے تھے کہ آسیہ نے دروازے پر کھڑے ہو کر گنگنائی آواز میں کہا۔

ابو دیکھئے کون آیا ہے؟

سعادت نے عظیم کو دیکھا پھر وہ اٹھے تیزی سے آگے بڑھے اور عظیم کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

شکر ہے تم نے بھی اس گھر میں اپنی شکل دکھائی ہے۔

آسیہ عظیم کے دفاع میں بولی۔

ابو! ابھی ان سے کوئی بات نہ کیجئے۔ پہلے کھانا کھالیں پھر میں خود ان سے بات

کر دوں گی۔



تینوں نے مل کر بڑے پرسکون اور خوش کن ماحول میں کھانا کھایا۔ پھر سعادت کھڑے ہو گئے اور دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے آسیہ سے کہا۔

تم دونوں بیٹھ کر باتیں کرو۔ میں تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔ شاید وہ ان دونوں کو موقع دینا چاہتے تھے کہ آپس میں باتیں کر لیں۔ عظیم نے بھی آسیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں اب چلتا ہوں۔

آسیہ اداس ہو گئی۔ کہاں؟

منہ اور کہاں۔

مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔

کہو۔

میرے ابو اور آپ کی امی نے ہم دونوں کی سنگنی کی تھی نا؟  
کی تھی؟

کیا اس ناٹے سے میں آپ سے کچھ کہنے کا حق رکھتی ہوں۔  
ضرور

تو پھر اپنے گھر رہے اور اُسے آباد کیجئے۔

میں کبھی اس گھر ضرور آؤں گا۔ جواب پوری طرح اُجڑ گیا ہے۔ میں اسے آباد کروں گا۔ پہلا بھی نہیں۔ ابھی مجھے کسی کی تلاش ہے۔

کس کی تلاش ؟

اپنی زندگی کے ایک ساتھی کی اسی لڑکی کی جس کا نام کل ہے اور جو مجھے  
ان دونوں ملنے آتی تھی جب میں پاگل اور کمرے میں بند تھا۔  
کب تک اسے ڈھونڈتے رہیں گے۔

میں اسے ڈھونڈ چکا ہوں۔ وہ ایک ویران اور تاریک کنویں میں ہے۔  
میں نے اسے وہاں سے نکالنا ہے۔

اگر نہ نکال سکے تب ؟

پھر میں تمہارے پاس آ جاؤنگا۔ اور جس طرح تم کہو گی کرونگا۔  
آسیہ نے بڑی آس اور اُمید سے کہا۔

میں آپ کے گھر میں آپ کا انتظار کروں گی۔ ابو نے میری شادی کرنے  
کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ میں نے انہیں کہا تھا۔  
آپ ایک بار مجھے غلیم کے حوالے کر چکے ہیں اور میں موت تک غلیم کی  
واپسی کا انتظار کروں گی۔ میں نے ڈاکٹری کر لی ہے امداد میں ابو کے  
کلینک میں کام کرتی ہوں۔

غلیم کھڑا ہو گیا۔ میں اب چلتا ہوں۔

پھر کب آئیں گے۔

کبھی ضرور آؤنگا۔ غلیم مڑھا امداد باہر نکل گیا۔ جب وہ بیرونی دروازے  
کی طرف بڑھا تو پیچھے سے آسیہ کی آواز سنائی دی۔



ٹھہرتے گا!

عظیم نے مڑ کر دیکھا کیوں  
میں آپ کو گاڑی میں چھوڑ کر آؤں گی۔

آسیہ نے گاڑی نکالی۔ اور عظیم کو لیکر مندر کی طرف روانہ ہو گئی۔ جب وہ  
دونوں مندر میں داخل ہوئے تو وہاں عاصفہ کی کار کھڑی تھی۔ عظیم کے ساتھ نیچے  
اترتے ہوئے آسیہ نے کہا۔ یہ گاڑی تو عاصفہ کی ہے۔ آج میں اس سے  
بھی بات کرتی ہوں۔

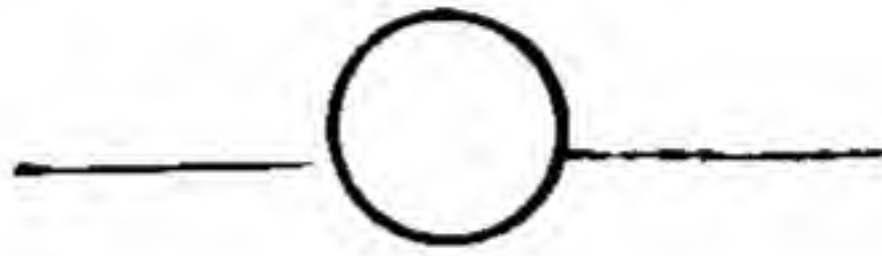
آسیہ عظیم کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ اندر عاصفہ بیٹھی تھی۔ عظیم  
کے بولنے سے قبل ہی آسیہ اس پر برس پڑی۔

اب تم عظیم کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑی ہو۔ آنٹی، عطیہ اور بے بی پہلے  
ہی تمہاری وجہ سے موت کے منہ میں چلی گئیں۔ قیصر سے تم نے طلاق لے لی اور  
وہ بھی خودکشی کر کے ہمیشہ کے لیے ہم سے روٹھ چکا ہے۔ اب ہمارے پاس اس  
گھر کی نشانی صرف عظیم رہ گئے ہیں اگر تمہاری وجہ سے انہیں کچھ ہو گیا تو یاد رکھنا آسیہ  
تمہیں زندہ نہ چھوڑے گی۔ اب اچانک تمہاری محبت کیوں جاگ اٹھی۔  
اس وقت کہاں تھی۔ جب عظیم کو چھوڑ کر قیصر سے شادی کر لی تھی۔ اٹھو اور  
دفع ہو جاؤ یہاں سے اور یہ یاد رکھنا۔ عظیم میرے منسوب ہیں اور ان کی سلامتی  
کی خاطر میں اپنی جان بھی گنوا سکتی ہوں۔

عاصفہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ ایک حسرت سے عظیم کو دیکھتی ہوئی باہر



نکل گئی۔ شاید وہ آسیہ کی موجودگی میں کچھ کہنا نہ چاہتی تھی۔ آسیہ  
بھی اس کے پیچھے پیچھے اپنی گاڑی لے کر چلی گئی۔



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : [www.iqbalkalmati.blogspot.com](http://www.iqbalkalmati.blogspot.com)



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھرڑ کھرڑ کی آواز کے ساتھ ٹھیلہ کھینچتا ہوا غلام ڈور تھقی کی عمارت کے باہر دکا۔  
اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر کمرے کے پاس آیا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا  
تو وہی بوڑھی عورت جو کمرے کے کمرے سے باہر بیٹھتی تھی۔ کمرے کی صفائی کر رہی تھی  
— غلام نے اس سے پوچھا۔

کمرے کہاں ہے؟

ملازمہ اس باہر بڑے اچھے طور سے پیش آتی۔

وہ یہاں نہیں باہر گئی ہیں۔

کہاں۔

غلام کی شوٹنگ پر گئی ہیں۔

کہاں ؟

یہ پتہ نہیں ۔  
کب تک آتے گی ۔

کچھ خبر نہیں کب آئیں ۔ ویسے دو چار روز تک آہی جائیں گی ۔  
عظیم خاموش ہو گیا ۔ آنکھوں میں ویرانی نمایاں ہو گئی اور چہرے پر افسردگی  
کے نقوش گہرے ہو گئے ۔ سر جھکاتے جب وہ مڑھنے لگا تو ملازم نے پوچھا ۔  
آپ بی بی کے رشتہ دار ہیں کیا ؟  
عظیم نے دکھ سے کہا ۔

انسانیت کے نام پر ہر انسان دوسرے کا رشتہ دار ہے ۔  
یہ تو ٹھیک ہے ۔ پر بی بی کسی کو بٹھاتی نہیں ۔ اس روز تمہیں کافی دیر تک  
کمرے میں بٹھایا اور جب تم چلے گئے تو بی بی بچاری سارا دن اپنے کمرے میں بند  
ہو کر روتی رہی تھی ۔

عظیم بھی مغموم ہو گیا ۔  
رشتہ تو ضرور ہے ۔ پر زمانے کی گردش نے ایسی راہیں بدلی ہیں کہ نہ منزل  
رہی اور نہ منزل کی نشاندہی کرنے والے راستے ۔  
بڑھیا نے آہ بھر کر کہا ۔

زمانہ بڑا ظالم ہے ۔ اس دور میں جتنا کتنا مہنگا ہو گیا ہے ۔ آپ بی بی کو لایا نہ  
کریں وہ بیمار ہیں ۔ زیادہ سگریٹ اور شراب پینے سے ان کے پیچھے میں ورم



ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر نے انہیں مکمل آرام کرنے کا مشورہ دے رکھا ہے۔ لیکن وہ دن رات کام کر کے اپنے آپ کو مصروف رکھتی ہیں۔ اس طرح ان کی تکلیف اور بڑھ گئی ہے۔ انہیں کھانسی کے بڑے بھیا نک دورے پڑنے لگے ہیں۔ ملازمہ خاموش ہو گئی اور عظیم سر جھکاتے باہر نکل گیا۔

ہفتے کا وقفہ ڈال کر عظیم پھر وہاں آیا۔ ملازمہ کمرے سے باہر بیٹھی ہوتی تھی۔ جس کا مطلب تھا مکمل آتی ہوتی ہے۔ ملازمہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔  
بی بی اندر ہی ہیں۔ آجائیے!

عظیم اسی صوفے پر بیٹھ گیا۔ جہاں پہلے روز بیٹھا تھا۔ مکمل نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب ایک طرف رکھ دی۔ انگلیوں میں دباتے ہوتے سگریٹ کے جلتے ٹوٹے سے اس نے دوسرا سگریٹ سلگا کر کش لیا اور عظیم سے مخاطب ہوئی۔

آپ میری غیر موجودگی میں بھی آتے تھے؟  
عظیم نے تیز نگاہوں سے اسے دیکھا۔  
آیا تھا۔

کوئی ضروری کام ہے کیا؟  
دیکھنے آیا تھا کہ اس روز کی بات چیت کا کوئی اثر ہوا ہے۔

پھر نادان ہیں آپ؟  
نادان نہ ہوتا تو آج یوں کتے کی طرح درد بد کی ٹھوکریں کیوں کھاتا پھرتا  
یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے۔

قسمت کا جال بھی انسان خود ہی بنتا ہے۔

کبھی کبھی حالات کی ستم خیزیوں کا دھارا اس قدر تیز ہوتا ہے کہ انسان اپنا رخ بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

عظیم نے اس کی ڈھارس بندھائی۔ پر یہ سب کچھ عارضی ہوتا ہے۔ انسان کوشش کرے تو اس دھارے پر بھی قابو پا سکتا ہے۔ نہیں تو جھٹک چکنے کے بعد پھر اپنی اصل راہ پر آ سکتا ہے۔ کل نے طنز کیا۔

کہاں واپس آ سکتا ہے؟ جہاں دھکے ہی دھکے ہوں؟

گردش میں ہی تو کامیابی ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا اگر تم پھر وہی کراچی کی پسلی میں کیمباڑی کی رہنے والی کل بن جاؤ تو سارے چکر ختم ہو جائیں گے۔

یہ نہیں ہو سکتا۔ وقت گزر چکا ہے۔ اور میں بہت فوری نکل گئی ہوں۔ کل اپنی جگہ سے اٹھی۔ اپنے کمرے کے اندر لوہے کا ایک کیبنٹ کھولا۔ سو سو کے نوٹوں کی ایک وزنی گھٹی نکال کر مڑھی اور وہ نوٹ عظیم کے سامنے پتاتی پر رکھتے ہوئے کہا۔ آپ یہ لیجائیں اور اپنی حالت سدھاریں۔

عظیم نے نوٹ اٹھا کر کل کی گود میں پھینک دیتے۔ میں بے غیرت نہیں ہوں۔ میں ان کی خاطر نہیں۔ صرف تمہیں لینے آتا ہوں۔

میں نہیں جاؤنگی۔

عظیم کی آواز پکپکا گئی۔ نہ ہی۔ تمہیں کوئی مجبور قہوڑا ہی کر سکتا ہے۔ کل کچھ کہنے لگی مٹی کہ ایک بار وہ کھانسی پھر اسے کھانسی کا ایسا دودھ پڑا نہ



وہ دیری ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور سگریٹ ہاتھ سے چھوٹ کر  
 قالین پر گر گیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔ شاید جکڑ گئی تھی۔  
 عظیم اس کی حالت دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ مکمل کی حالت جب کچھ سنبھلی  
 تو عظیم نے نجیب میں ہاتھ ڈالا کچھ نوٹ نکالے اور اٹھ کر مکمل کی گود میں رکھتے  
 ہوئے کہا۔

یہ دو سو روپیہ ہے۔

مکمل نے فوراً پریشانی میں پوچھا۔

کیسے؟

جب میری ماں اور بہنوں کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا تو کراچی سے آتے  
 ہوتے رقم نے مجھے چھ سو روپیہ دیا تھا۔ میرے پاس رقم ہوتی تو یکمشت ہی تمہیں  
 ادا کر دیتا۔ دو سو کی قسطوں میں تمہاری وہ رقم میں پوری کر دوں گا۔  
 مکمل غم سے پگھل سی گئی۔

مجھے اب ان کی ضرورت نہیں۔

پر میں کسی کا مقروض نہیں مرنا چاہتا۔

میں نے یہ قرض معاف کیا۔

میں اتنا بے غیرت نہیں کہ ایک عودت سے لی ہوئی قرض کی رقم نہ اتار

سکوں۔ ابھی میں جوان ہوں۔ میرے بازوؤں میں قوت ہے۔ میں محنت مزدوری

کر سکتا ہوں۔ جب بوڑھا ہو گیا تو چپ چاپ اپنے آپ کو موت کے حوالے

کر دوں گا۔

کل بالکل پہلی ہو گئی۔ قبل اس کے وہ کچھ کہتی ملازمہ اندر آتی وہ ایک ٹرے اٹھائے ہوئے تھی جس میں دو بوتلیں اور تین پلیٹوں میں کچھ کھانے کی چیزیں تھیں ملازمہ نے ٹرے غلیم کے سامنے تیاہی پر رکھ دی اور کل کا اشارہ پا کر باہر نکل گئی۔ کل اٹھی اور غلیم کے سامنے کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ کل نے بوتلوں کے ڈھکن کھولے اور غلیم سے کہا۔

پیجئے !  
غلیم نے کوئی جواب نہ دیا اٹکل سے کہا۔  
مجھ پر ایک احسان کرو۔

کیا؟

مجھے یہ بتادو، سیدل کہاں ہے تاکہ میں یہ دیکھ سکوں کہ تمہارے اور اس کے خون میں کتنا فرق آگیا ہے۔

کل کہیں کھوہ گئی۔ پھر وہ اٹھی اور ایک کاغذ پر سیدل کا پتہ لکھ کر غلیم کو قہما دیا۔ غلیم کھڑا ہو گیا۔ میں اب چلتا ہوں۔

کل نے بوتلوں کی طرف اشارہ کیا یہ تو پی کر جائیں۔

ابھی میں اس قابل نہیں۔ جب اس قابل سمجھو نگی پی لوں گا۔ غلیم باہر نکل گیا اور کل سے اسے حسرت سے دیکھتی رہ گئی۔

کل کے پاس سے نکل کر غلیم نے اپنا ٹھیلہ اڈے پر کھڑا کیا اور بس سے وہ



سیبل کے سکول جا پہنچا۔ ہوسٹل کے گیٹ پر کھڑے ہو کر اس نے چوکیدار سے  
سے سیبل کو بلانے کے لیے کہا۔ چوکیدار نے اسے استقبالیہ میں بٹھایا اور خود  
اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد استقبالیہ میں سیبل داخل ہوئی اور بھتیجا! بھتیجا پکارتی ہوئی  
وہ غلیم سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ غلیم کا جی بھی مہر آیا تھا۔ غلیم کے سامنے  
بیٹھتے ہوئے سیبل نے شکایت کیا۔

اس مندر والی عمارت سے نکل کر ہم نے بہت دھکے کھائے بھتیجا۔ وہاں  
سے ہم دونوں بہنیں ریلوے اسٹیشن آتی تھیں۔ ایک شخص جو اصل میں بد معاش  
تھا۔ اس نے باجی کو بہن کہا اور ہم دونوں کو اپنے کوارٹر لے گیا۔ وہاں اس نے  
باجی کی عزت ٹوٹنا چاہی۔ پر باجی گھر سے ایک چاقو لیکر نکلی تھی۔ بس وہ چاقو  
اڑے آیا اور باجی نے اپنے آپ کو اس بد معاش سے بچا لیا۔

وہاں سے نکل کر رات کو ہم نے اپنی زندگی کا سب سے برا وقت دیکھا۔ اس  
رات بڑی سردی تھی۔ بارش بھی ہو رہی تھی۔ ایک رحم دل قلی نے ہمیں پناہ دی  
وہاں رہتے ہوئے باجی کو اسکول میں سردی بھی مل گئی۔ پر ایک روز بخشو وہاں  
پہنچ گیا اور اس نے بدنام کر کے باجی کو وہاں سے بھی نکلنے پر مجبور کر دیا۔

پھر ہم دونوں بہنیں اسی ہوسٹل میں رہنے لگیں۔ پر تقدیر شاید ہم دونوں  
بہنوں پر خوش نہ تھی۔ یہاں بھی باجی کا ایک شناسا آ نکلا۔ اس نے باجی سے  
شادی کرنا چاہی۔ جب باجی نے انکار کر دیا تو اس شیطان نے باجی کی ساری

داستان ہیڈ مسٹر لیس سے کہہ دی۔ اور یوں باجی کو اس سکول سے بھی نکال دیا گیا۔ سیبل نے دیکھا۔ غلیم کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے سیبل کھڑی ہو گئی۔

میں آپ کے لیے بوتل منگوؤں بھیا۔

غلیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ رہنے دو بے بی۔ سیبل نے ہاتھ چھڑایا اور باہر بھاگی۔ چوکیدار سے اس نے دو بوتلیں لالے کو کہا اور دوبارہ غلیم کے پاس بٹھیتی ہوئی بولی۔

اب باجی سے ناراض کیوں ہیں بھیا۔

میں تھوڑا ناراض ہوں بے بی۔ وہ ہی مجھ سے بات نہیں کرتی۔ میں تو اب بھی اس سے ملنے اس کے پاس جاتا ہوں۔

سیبل نے حیرت سے کہا

باجی تو کہتی تھیں۔ غلیم ہم سے ناراض ہیں۔ اب پتہ چلا وہ جھوٹ کہتی رہی ہیں۔ جب ہم دونوں بہنیں دھکے کھا رہی تھیں تو میں باجی سے کہتی تھی۔ باجی ہم غلیم بھاتی کے پاس چلی جائیں اور جس طرح ابو کی مرضی تھی آپ۔ اُن سے شادی کر لیں۔ پر باجی رو پڑتی تھی اور کہتی تھی غلیم ہم سے ناراض ہیں۔ چوکیدار دو بوتلیں رکھ گیا اور وہ پلینے لگے۔

سیبل نے پوچھا۔ آپ ابھی تک اسی مندر میں رہتے ہیں بھیا  
ہاں وہی رہتا ہوں۔



کوئی سروس ملی -

نہیں ٹھیلہ ہی کھینچتا ہوں -

سیبل افسردہ ہو گئی -

آپ یہ کام چھوڑ دیں بھتیہ - یہ بہت سخت کام ہے - آپ تھک جاتے ہونگے  
 باجی کی اب کافی واقفیت ہے - میں انہیں کہوں گی وہ آپ کے لیے کہیں سروس  
 کا بندوبست کریں -

نہیں بے بی اسے مت کہنا - میں یہی کام کر دوں گا -

نہیں بھتیہ - آپ یہ کام کیوں کریں گے -

عظیم نے بات کا رخ بدلا - کمل تمہیں ملنے آتی ہے -

آتی ہے بھتیہ - کم از کم مہینے میں دوبارہ تو ضرور آتی ہے -

کتنے پیسے دیکر جاتی ہے -

میری ضرورت سے زیادہ ہی دے جاتی ہیں - ایک خوش خبری

بھی کہوں آپ سے -

کیا ؟

باجی کوشش کر رہی ہے کہ کوئی بنی بناتی کوٹھی خریدے پھر آپ بھی

ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے بھتیہ -

کمل نہیں مانگی -

کیوں نہیں مانگی -

غلیم نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بیس روپے نکالے اور سیبل کی طرف بڑھائے۔

یہ رکھ لو بے بی !

سیبل نے نوٹ لیکر دوبارہ غلیم کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔  
آپ کو قسم ہے بھیا۔ اگر آپ مجھے کچھ دیں۔

اچھا میں اب چلتا ہوں۔ غلیم کھڑا ہو گیا۔ سیبل دروازے تک اسے  
چھوڑنے آئی پھر اندر چلی گئی۔

---



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اندھیرا پھیل گیا تھا

گپ اندھیرا

روشنی اور تاریکی کے ننگ ڈر جنگ نقوش ایک دوسرے سے منسلک گیر  
ہو کر چار دانگ بکھر گئے تھے۔ شروع سادہ کی ٹھنڈی پرواہر چیز پر غماز بکھیر رہی  
تھی۔ عظیم ریڑھا کھینچتا ہوا عمارت میں داخل ہوا۔ آج وہ بے حد ادا اس تھا۔  
کل نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر کے اس کا دل جو توڑ دیا تھا ٹھیلہ  
املاس تلے کھڑا کر کے وہ وہیں بیٹھ گیا۔

اسی لمحہ شاموں باہر نکلا۔ اس نے شاید ٹھیلے کے پہیوں کی آواز  
سن لی تھی۔ وہ عظیم کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ عظیم نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں

۳۱۲

شاموں نے اسے پکارا۔ غظیم !  
 غظیم چونکا اور آنکھیں کھول دیں۔  
 آج بہت دیر کر دی بیٹا !  
 بس ہو گئی بابا !

اداس اور پریشان بھی ہو ؟  
 وہ تو سدا ہی سے ہوں  
 کل کے پاس تو نہیں گئے تھے ؟  
 کیا تھا۔

پھر کیا کہتی ہے  
 کسی کی مجبور می کو کون مانتا ہے بابا !  
 یہاں نہیں آتی ؟  
 نہیں۔

وجہ ؟  
 بس گرے ہوئے کو ہر کوئی کھلتا ہے۔  
 یہ تو شیوہ ہے۔ اس دنیا کا

غظیم نے املتاس سے ٹیک لگالی اور لمبا سانس لیا۔ یہ دنیا خوش رہے  
 بابا ! اپنی خبر ہے۔ کچھ کٹ گئی ہے۔ کچھ کٹ جاتے گی۔ مجھے تو اپنے رشتہ دار  
 چھوڑ گئے ہیں۔ کل سے کیا سکھوہ وہ تو پرانی لڑکی ہے۔



شاموں نے سوچتے ہوئے کہا۔ آج پھر عاصفہ آتی تھی۔

آنے دو آتی ہے میں کیا کروں۔

کل بھی آتی تھی۔ بہت روتی تھی بچاوی

اس کی قسمت میں ہی اب رونما ہے

میری مانو اس سے شادی کر لو

نہیں بابا۔ اس سے شادی کے متعلق میں اب سوچ بھی نہیں سکتا

پھر ایک کام اور کرو

کیا

کسی طرح کل کو یہاں لے آؤ۔ میں اسی سے تمہاری شادی کر دیتا ہوں۔

بوڑھا شاموں جذباتی ہو گیا۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں بیٹے !

تمہاری خوشی سے ہی اب میری خوشی ہے۔

غظیم گل کر رہ گیا۔ میں جانتا ہوں بابا ! لاہور جیسے عظیم شہر میں جبکہ میں دھکے کھا رہا تھا۔ میرے پاس سر پھپھانے کو جگہ نہ تھی۔

میری کوئی منزل نہ تھی

کوئی آواز نہ تھی

میری حالت سڑکوں پر آوارہ گھومنے والے کتوں سے بھی بدتر تھی۔ اس

وقت میں بے سہارا تھا۔ میرے عزیزوں نے دھتکار رہا تھا۔ اس وقت جبکہ

جبکہ میں ٹہنی سے ٹوٹا ہوا ایک خشک پتا تھا۔ تم نے مجھے سہارا





یہ دورہ

ہاتے ————— اس دور میں ماں بکنے لگی ہے۔

بہن بیٹیاں لٹنے لگی ہیں۔

یہ ————— یہ بڑی بڑی قوتوں والے سیٹھ

یہ لمبی لمبی کاروں والا طبقہ

مشراب پیتے ہیں ————— دوسری کی بیٹیوں کا رقص دیکھتے ہیں۔

یہ ————— یہ دوسروں کی عزت سے کھیلنے والے دیوتا

کیا ان کے ہاں بیٹی نہیں

ان کے ہاں بیوی نہیں

ان کی کوئی ماں نہیں ہے۔ ان کا رقص کیوں نہیں دیکھتے۔ انہیں سر عام کیوں

نہیں نچواتے۔ کیونکہ یہ دولت کی جھلک پر اوروں کی امانتیں چھین بیٹے ہیں ان

کے ہاں بھی ہر چیز ہے۔ ہر رشتہ ہے۔ پر انسان ہی بدل گیا ہے بابا۔ انسانیت

ہی کہیں کھو گئی ہے۔ لوگ دوسروں کی تکلیف پر ہنستے اور قہقہے لگاتے ہیں۔ خدا

پیدا ہی نہ کرتا اس دور میں تو بہتر تھا۔

رشتوں کی آڑ میں سانپ ہیں۔

قدم قدم پر خونخوار بھیڑیے ہیں۔

ہر کوئی دس لینے کو بھاگتا ہے۔

ہر کوئی چیز پھاڑنے کو دوڑتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کتا کتے کا بیری - میں کہتا ہوں کتا کتے کا نہیں - انسان انسان کا بیری ہے - شاموں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا - بہت جذباتی ہو گئے ہو - لگتا ہے کل سے جھگڑا کر آئے ہو -

چند لمحوں کے سکوت کے بعد بوڑھا شاموں بولا -

اب اگر عاصفہ آئے تو میں اسے کیا کہوں - وہ آج کئی روز سے میرے پاؤں پکڑ پکڑ کر سما جتیں کر رہی ہے کہ عظیم کو مجھ سے راضی کر دو -

عظیم نے رکھائی سے کہا - اب اگر یہاں آئے تو اسے نکال دینا - دھکا دے دینا اسے یہ تو اچھی بات نہیں -

کہنا عظیم مر گیا ہے -

میں اتنی بڑی بات کیونکر کہہ سکتا ہوں -

پھر جو تمہارے جی میں آئے کہہ دینا - پر وہ یہاں آنا بند کر دے -

وہ بہت نبور ہے -

کبھی میں بھی مجبور تھا -

بات بات پر رونے لگتی ہے - تمہاری خاطر ہی اس نے اپنے شوہر سے

طلاق لے لی ہے -

کبھی میں بھی اپنی تقدیر پر بہت رویا تھا جب اس نے کسی کی خاطر مجھے

پھوڑ دیا تھا -

اس سے انتقام لینا چاہتے ہو -



انتقام تو اس سے تقدیر لے گی۔

غظیم نے بڑی بیزاری سے کہا۔

تم اس کی اتنی طرفداری کیوں کر رہے ہو بابا

شاموں نے دُکھ سے کہا۔ اس کی حالت آجکل عجیب ہو رہی ہے۔ بات

بات پر اس کے آنسو آ جاتے ہیں۔ جسم کا پینے لگتا ہے اور ٹھنڈے پینے آنے

لگتے ہیں۔ بچاری کو۔ کہہ رہی تھی اب تو اکثر میرا دل بھی ڈوبنے لگا ہے۔ غظیم میرے

بیٹے میں تو کہتا ہوں اس سے شادی کر لو۔ گرے ہوئے انسان کو کچلنا نہیں چاہیے۔

ایک مجبور کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔

غظیم کہیں دُور سے بولا۔ یہ نہیں ہو سکتا بابا! میں کل کو چھوڑ کر حاصدہ کو نہیں

اپنا سکتا۔ میں کل کا انتظار کرونگا۔ ایک روز میں اسے اپنی راہ پر لا کر چھوڑ دوں گا۔

خواہ اسی کشمکش میں بوڑھا کیوں نہ ہو گیا۔ پر میں اسے اپنا ڈنگا ضرور۔ وہ میرے

پاس ضرور آئے گی بابا! خواہ موت سے چند گھنٹیاں ہی پہلے آجائے۔ پھر بھی

سمجھو نگا میری محنت بیکار نہیں گئی۔

بابا! میں اپنی منزل کا یقین کر چکا ہوں اور اس سے انحراف نہیں چاہتا۔

اسی میں میرا فائدہ۔ میری بھلائی ہے۔ کل میری منزل ہے۔ بابا! اگر کل مجھے نہ ملی

تو اس کے بعد میرا سب سے زیادہ حق دار میری سب سے عزیز متاع آسیہ

ہو گی۔ جس سے میری ماں نے میری تنگنی کی تھی اور وہ خود دار اور محبت کرنے

والی لڑکی اب بھی میرے گھر بیٹھ کر میری واپسی کا انتظار کر رہی ہے۔ تم نے دیکھا

نہیں بابا! وہ عاصفہ سے کہیں زیادہ حسین اور پر خلوص ہے۔  
 دونوں چند لمحوں تک خاموش رہے۔ عظیم بھی سر جھکاتے کچھ سوچتا رہا پھر وہ  
 جوالا خضر بن کر مچھٹ پڑا۔

بابا! عاصفہ نے جیسا سلوک میرے ساتھ کیا۔ اس کی سزا اسے ملنی چاہیے۔  
 ضرور — ضرور ملنی چاہیے۔

کئی لوگ اس سے عبرت پکڑیں گے۔  
 کئی بھٹکی ہوئی عورتیں اس کے کردار سے نصیحت پکڑیں گی۔  
 یہ تقدیر کا فیصلہ ہے بابا! میں مجبور ہوں کچھ نہیں کر سکتا۔

وہ تڑپے گی جس طرح میں تڑپا تھا۔  
 وہ بھی پاگل ہوگی جس طرح میں ہوا تھا۔  
 مجھ پر قہقہے لگانے والوں پر لوگ قہقہے لگائیں گے۔  
 شاموں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ وفتح کر دایسی باتوں کو اٹھ اندر چل کر  
 کھانا کھاؤ۔ عظیم اٹھا اور شاموں کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔



سورج ابھی طلوع ہی ہوا تھا۔ آفتاب گھرے سے باہر چھلے پر بیٹھا ناشتہ  
تیار کر رہا تھا۔ املتاس سے ٹھیک لگاتے شاموں حقہ پی رہا تھا اور اس سے قریب  
ہی غلیم اپنے ٹھیلے کے پیٹے پر پانی ڈال رہا تھا۔ اتنے میں ایک کار احاطے میں  
داخل ہوئی۔ غلیم کے قریب آکر کار کی اور عاصفہ اس میں سے اتری۔ غلیم نے  
ایک بار اسے دیکھا۔

وہ اداس اور پریشان تھی۔  
غمگین اور افسردہ تھی۔

غلیم بے تعلق سا ہو کر پھر اپنے کام میں لگ گیا۔  
شاموں نے حقہ پینا بند کر رہا تھا۔ ناشتہ بناتے ہوئے آفتاب کے

ہاتھ رک گئے تھے اور وہ دونوں عظیم اور عاصفہ کی گفتگو کا انتظار کرنے لگے تھے۔  
عاصفہ چپ چاپ عظیم کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ عظیم نے اسے گھور کر دیکھا۔  
کیوں آتی ہو یہاں۔

بکچھ دیر تک عاصفہ بول نہ سکی۔ شاید اپنے آپ پر قابو پا رہی تھی۔ پھر بڑی  
مشکل سے اس نے جواب دیا۔

میں — میں آپ سے اپنی غلطی کی معافی مانگنے آئی ہوں۔  
معاف کرنے والا تو خدا ہے۔ اس سے معافی مانگو۔

آپ معاف کر دیں پھر شاید خدا بھی معاف کر دے۔  
غلطی کس کی تھی؟

میری  
مجھے پاگل کس نے بنایا؟

میں  
میری ماں اور بہنوں کا قاتل کون تھا؟

میں  
قاتل کی سزا؟  
قتل

پھر  
عاصفہ رو پڑی۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیجئے میں اُن نہ



کہوں گی —

میں تو پہلے ہی گناہ گار ہوں ؟  
ایک گناہ اور بھی میری خاطر  
جو خود ختم ہو چکا ہو وہ کسی کو کیا ختم کرے گا۔ جاؤ چلی جاؤ یہاں سے اپنے  
آپ کو حالات کے سپرد کر دو۔

تقدیر خود تم سے انتقام لے گی۔

حالات خود اپنے آپ کو دہرائیں گے۔

آج یہاں سے آپ کو میری لاش ہی اٹھا کر باہر پھینکا ہو گی۔

یہ کام بھی کوئی اور ہی کرے گا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔

مناشاموں اپنی جگہ سے اٹھا۔ بیساکھیاں ٹیکتا ہوا وہ ان دونوں کے پاس

آیا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ قریب آکر اس نے دونوں سے کہا۔

دونوں اندر جا کر آرام سے بات کرو۔ باہر شور کرنے کا کیا فائدہ جس نے

نہیں سنا وہ بھی سنے گا۔ عاصفہ فوراً اندر چلی گئی۔ عظیم امتاس سے ٹیک لگا  
کر بیٹھ گیا۔

میں نہیں جاؤنگا اندر اسے کہو چلی جاتے یہاں سے

شاموں نے بڑی شفقت سے کہا۔ گھر آتے ہوئے انسان کی بے عزتی

نہیں کرنی چاہیے۔ عظیم نچتے میں کھڑا ہو گیا۔ چلو میں اس سے بات کرتا ہوں۔

یہ روز روز کا تماشا ہی ختم ہو جاتے۔ اندر آتے ہی عظیم عاصفہ پر برس پڑا۔

میں نے تمہیں منع نہ کیا تھا یہاں مت آیا کرو  
عاصفہ نے بڑی عاجزی سے کہا۔ کہا تھا۔  
پھر تم کیوں آتی ہو۔

میں مجبور ہوں۔

غلام زور سے چلا۔ مجبور! مجبور! مجبور! ہر کوئی اپنی جگہ مجبور ہے۔ میں نے  
تمہیں کہا تھا نا میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔  
عاصفہ افسردہ ہو گئی۔ جی

اور یہ بھی کہا تھا مجھے گھسی اور سے محبت ہے اور مجھے اس کی تلاش ہے  
کہا تھا مگر میں آپ کو ایک طوائف سے شادی نہ کرنے دوں گی۔  
غلام برس پڑا۔

طوائف وہ نہیں۔ تم ہو۔ میری نگاہوں میں وہ پھول سے بھی زیادہ پاکیزہ

ہے۔

عاصفہ ہنسنے لگی تھی۔ ہوگی۔

تو پھر جاؤ چلی جاؤ یہاں سے۔

عاصفہ نے دھڑکے سے کہا۔ میں آپ کو ساتھ لے بغیر نہ جاؤں گی۔ آپ کے

بغیر اب میری زندگی ادموری ہے۔

غلام نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔

اس وقت تم کہاں تھی۔ جبکہ رات کے اندھیرے میں قیصر کا ماتہ تمام کر



تم نے کہا تھا۔ میں غلیم سے نہیں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اس وقت تم کہاں تھی۔ جب میں کراچی دھکے کھاتا رہا۔ اس وقت تمہاری محبت کو کیوں زنگ لگ گیا تھا۔ جب میری ماں اور بہنیں مر گئی تھیں اور کسی نے میرا دکھ نہ بانٹا تھا۔ اس وقت تم کہاں تھی۔ جب میں پاگل ہو گیا۔ انکل اور آسیہ کے علاوہ اس وقت میرا کوئی پرسان حال نہ تھا۔

غلیم کہتا رہا

تم میری ماں اور بہنوں کی قاتل ہو  
میری بربادی کی ذمہ دار ہو

میری زندگی کی سب سے بڑی ٹھوکر ہو۔

میں اپنے قاتل کو گلے کا ہار کیوں بنا لوں

کیوں میں ٹھوکر کو میں پاؤں کی زنجیر بنا لوں — بولو — جواب دو۔  
گھگھیاٹی آواز میں عاصفہ نے کہا۔

گناہ کے بعد تو خدا بھی توبہ قبول کر لیتا

غلیم نے ویسے ہی غصے میں کہا

توبہ کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ توبہ تو فرعون نے بھی کی تھی۔ پر خدا نے

اسے مستبول نہ کیا۔ غلیم حب باہر نکلنے لگا تو عاصفہ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو

پکڑ لیا۔ غلیم نے اسے گھور کر دیکھا اور پوچھا۔

کیا ہے ؟

عاصفہ روپڑی۔ میرے ساتھ آج فیصلہ کر کے جائیے۔

کیسا فیصلہ؟

جس کے لیے میں آتی ہوں۔

فیصلہ تو اس روز ہی ہو گیا تھا جس روز تم نے قیصر سے شادی کر لی تھی۔

وہ میری غلطی تھی

غلطی کی سزا بھگتو

صرف ایک بار معاف کر دیں۔ پھر زندگی بھر ایسی غلطی نہ کر دنگی۔

خدا سے معافی مانگو

پہلے آپ تو معاف کریں۔

میں نے تمہیں کیا تھا نا۔ میں کل سے شادی کر دنگا

جی کہاں تھا۔

تم جب قیصر سے شادی کرنے لگی تھی۔ میں نے کوئی اعتراض کیا تھا۔

نہیں کیا تھا۔

اب جبکہ میں کل سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو تم کیوں شور کرنے لگی ہو۔

کیوں تمہیں تکلیف ہونے لگی ہے۔ خاموش رہو اور قسمت کا تماشا دیکھتی رہو۔

میرا آج بھی یہی جواب ہے کہ مجھے تم سے نفرت ہے اور کل بھی۔

عظیم باہر نکلا۔ اپنے ٹھیلے کے پاس آیا اور اسے کھینچ کر باہر لے جانے لگا۔

آفتاب اپنی جگہ سے اٹھا اور بھاگ کر عظیم کا راستہ روک لیا۔



ناشتہ کر کے جاؤ بھیا

عظیم نے غصے میں آفتاب کو ایک طرف ہٹا دیا۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔  
آفتاب بھاگتا ہوا اندر گیا اور شاموں سے کہا۔

بابا! عظیم بھیا کھانا کھائے بغیر ہی کام پر جا رہے ہیں۔

شاموں نے اپنی بیا کھیاں ٹیکتا ہوا تیزی سے باہر نکلا اور عظیم کو آواز دی۔

عظیم! عظیم۔ رک جاؤ بیٹے۔ تمہیں قسم ہے جو نہ رو۔

عظیم رک گیا۔ شاموں اس کے قریب آیا اور دکھ سے کہا۔

کھانا تو کھا کر جاؤ بیٹے!

عظیم نے ہلکے سے کہہ دیا۔

بھوک نہیں ہے بابا!

شکستہ سی آواز میں شاموں نے کہا۔

بھوکے یہ ٹھیلہ کیسے کھینچو گے۔ چلو واپس چلو۔

آفتاب نے بھی منت کی۔

کھانا کھا کر جاؤ نا بھیا!

عظیم نے شاموں کی طرف دیکھا۔ بڑی جی بے بسی کی سی حالت میں۔ دونوں

کی نگاہیں ملیں۔ دونوں کی نگاہوں میں آنسوؤں کا بوجھ تھا۔ پھر عظیم نے پگھلا دینے

والی آواز میں کہا۔

میری طبیعت پہلے ہی خراب ہے بابا! مجھے اور زیادہ پریشان نہ کریں۔

مجھے بھوک ہوتی تو کھا لیتا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے اور زیادہ نہ الجھائیں  
 عظیم اپنا ریڑا کھینچتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ شاموں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے  
 موٹے قطرے بہہ نکلے تھے۔ وہ اپنی آئینوں سے اپنی آنسو پونچھتے ہوئے عظیم کو  
 جاتا دیکھ رہا تھا۔ آفتاب کا سر بھی جھک گیا تھا۔ دونوں سر جھکائے واپس آگئے۔  
 عاصفہ کے پاس آکر شاموچٹ پڑا۔

تم یہاں مت آیا کرو بیٹی! تمہاری وجہ سے عظیم ہم سے بھی دوڑھ گیا ہے۔  
 وہ میرا بیٹا ہے اور میں اب اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ میری سالنوں  
 کا تعلق اور میرے سر پر کی آتما ہے۔ شاموں فرش پر بیٹھ کر رونے لگا۔ عاصفہ  
 سر جھکائے باہر نکل گئی۔ وہ بالکل گم سی دکھائی دیتی تھی۔ بالکل پاگلوں کی سی حرکتیں  
 کرتی وہ کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔





سہ پہر کے قریب غلیم نے اپنا ہڑہ ڈھونڈتھی کی عمارت کے باہر روکا اور  
 اوپر چڑھ کر کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں اپنے پلنگ پر گہری نیند سو  
 رہی تھی۔ وہ صوفے پر جا کر بیٹھ گیا اور کمرے کے بیدار ہونے کا انتظار کرنے لگا۔  
 تھوڑی دیر تک وہ خود بھی وہاں بیٹھے بیٹھے ادنگ گیا تھا۔  
 جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اس کے سامنے بیٹھی تھی غلیم نے آنکھیں ملیں۔  
 اور یہ حاکم ہو کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں اس کی حالت پر سکتے ہوئے پوچھا۔  
 کب آئے آپ۔

اپنی ادھڑی ہوئی آستین درست کرتے ہوئے غلیم نے جواب دیا۔ کافی دیر  
 کا آیا ہوا ہوں۔

اگر آپ کوئی چیز کھائیں تو مشکوٰۃں۔

نہیں

پھر حکم کریں۔

میں آج آخری فیصلہ کرنے آیا ہوں

کیسا فیصلہ

تمہیں ساتھ لیجانے کا

وہ فیصلہ تو میں کئی بار پہلے بھی دے چکی ہوں۔

پر مجھے وہ منظور نہیں

آپ کیا چاہتے ہیں۔

تمہیں آج میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ لوگ مجھے طرح طرح کی باتیں سنانے

لگے ہیں۔ میں آج تمہیں ساتھ لیجا کر ہر ایک کا منہ بند کر دینا چاہتا ہوں۔

پر میں نہیں جاؤنگی۔

غظیم نے اس کا بازو پکڑ لیا اور پہلی بار وہ غصے میں غرایا۔

تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔

کمل نے اپنا بازو غظیم کے ہاتھ میں ہی رہنے دیا اور اسے چھڑانے کی

کوشش نہ کی۔ پھر اس نے پرسکون ہجے میں کہا۔

کوئی زبردستی ہے کیا۔

غصے میں غظیم نے تن کر کہا۔ ہاں زبردستی ہے۔



پھر آپ کی بھول ہے۔

تو تم نہیں جاؤ گی۔

نہیں

پھر سوچو

نہیں

عظیم نے کل کو اپنی طرف کھینچا اور دو بھر ٹوپ تھپڑ اس کے منہ پر دے مارے  
اور غصے میں زور سے غرایا۔

ذیل کمینی! تمہاری خاطر میں کہاں سے کہاں چلا آیا اور تم پر اثر ہی نہیں۔ اگر  
تمہارے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہ تھی تو کیوں مجھ سے اتنی ہمدردی بڑھاتی۔  
کیوں تم نے مجھ سے عمر بھر میرا انتظار کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

میں تمہیں گناہوں کی دلدل اور دھسان سے نکالنا چاہتا ہوں اور تم اس  
کی گہرائی میں جاتی ہو۔

کل رونے لگی۔ عظیم غصے میں زور سے غرایا  
کہاں گئی وہ کل جب میں کراچی سے چلا تو وہ رو پڑی تھی۔  
تم عورت نہیں طوائف ہو۔

لوگ مجھے ٹھیک ہی طعنہ دیتے ہیں۔  
عاصفہ ٹھیک ہی کہتی تھی تم طوائف ہو۔  
تم گناہ گار ہو۔ عادی گناہ گار

یوں جگہ جگہ عزت بیچنے سے تو بہتر تھا کہیں ڈوب مرتیں لوگ یہی کہتے  
فرائس کے ہاں لڑکی نہ تھی۔ یہ تو نہ کہتے فرائس کی بیٹی طوائف ہے تمہارے  
باپ کی روح کیا کہتی ہوگی۔

تم — تم خوشی یہ دھندا کرتی ہو — تم — عظیم نے کل کو بالوں سے  
پکڑ لیا اور کئی طاپچے اس کے منہ پر دے مارے۔ کل فرش پر گر کر اپنے لگی تھی۔  
عظیم نے اسے پاؤں کی ایک سخت ٹھوکہ ماری۔ کل شدت تکلیف سے کراہ اٹھی۔  
اس پر غشی سی طاری ہو گئی اور منہ سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔

اسی لمحہ کسی نے پیچھے سے عظیم کی گردن پر چکر دینے والا کتہ دے مارا۔ عظیم  
نے مڑ کر دیکھا۔ کل کے دونوں ہاڈی گارڈ اس کے سامنے کھڑے بھوکے بھڑوں  
کی طرح اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دونوں آگے بڑھے اور عظیم پر ٹوٹ  
پڑے عظیم بھی مستعد ہو گیا تھا اور اولوں کی طرح ان پر برس پڑا۔ وہ دونوں دائیں  
بائیں ہو کر عظیم پر یکے برسا رہے تھے۔ جواب میں عظیم بھی انہیں اپنے مکوں کی سخت  
باڈھ پر سکے ہوئے تھا۔

کل جب کچھ سنبھلی تو اس نے دیکھا وہ تینوں بڑی طرح آپس میں لڑ رہے تھے  
عظیم کی پیشانی مچٹ گئی تھی اور وہاں سے خون بہہ رہا تھا جو اس کی قمیض کو  
رنگین بنا رہا تھا۔ کل کے اپنے ہاڈی گارڈ بھی خون آلود تھے اور اس بوڑھے  
بیل کی طرح ہانپ رہے تھے جو دھوپ میں طویل محنت کے بعد فارغ ہوا ہو۔  
کل لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی اور اپنے دونوں ہاڈی گارڈ کے منہ پر اس کے



طمانچے مارنے شروع کر دیئے۔

ذلیل کہینو!

بے غیرت نمک حرامو!

کس نے تمہیں ان پر ہاتھ اٹھانے کو کہا۔ آج یہ مجھے جان سے مار دیتے تو میری خوش قسمتی تھی۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ دونوں محافظ باہر نکل گئے۔ مکمل اپنی ساڈھی کے پلو سے جب غظیم کی پیشانی صاف کرنے لگی تو غظیم نے نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

دور رہو مجھ سے۔

مکمل نے غظیم کا بازو پکڑ کر اپنے بستر کی طرف کھینچا۔ ادھر آکر لیٹیں میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔

غظیم کی قمیض جو لڑتے لڑتے پھٹ گئی تھی۔ اسے اس نے اپنے بدن پر درست کرتے ہوئے کہا۔ میں جا رہا ہوں۔ آج کے بعد میرا تمہارا کوئی ناٹھ نہیں۔

مکمل اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

میں آپ کو اس حالت میں باہر نہ جانے دوں گی۔

غظیم نے اسے دھکا دیکر ایک طرف ہٹا دیا۔ تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی مکمل رو پڑی۔ میں آپ کے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔ میں وہی کروں گی جو آپ کہیں گے میں آپ کی خاطر سب کو چھوڑ دوں گی۔ ذرا ٹھہریئے میں ابھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں

عظیم اس وقت بے پناہ غصے میں۔ لہذا اس نے کمل کی باتوں کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ ورنہ وہ ایسا سنگدل تو نہ تھا کہ کمل کو اپنے ساتھ نہ لیجاتا۔ اس نے کمل کو دھکا دیکر فرش پر گرا دیا۔

دُور ہو میری نگاہوں سے۔ عظیم تیزی سے باہر نکل گیا۔ کمل عجیب طرح سے نڈھال ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ اٹھی۔ بری طرح لڑکھڑاہی تھی۔ قدم رکھتی کہیں اور پڑتا کہیں تھا۔ ڈمگاتی ہوئی وہ عظیم کے پیچھے لپکی پر ایک کرسی سے ٹکراتی اور جھول کھاتی ہوئی بری طرح دیوار سے لگی۔ بڑی بے بسی کے عالم میں اس کے منہ سے نکلا۔

آہ میں مر گئی۔ اوردہ وہیں گر کر ڈھیر ہو گئی۔ ملازمہ بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور اسے سنبھالنے لگی۔

اپنا ٹھیلہ کھینچتا ہوا عظیم ابھی عمارت سے نزدیک ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے اسے پکارا۔ عظیم! عظیم۔ اس نے مڑھ کر دیکھا۔ کمل کی بوڑھی ملازمہ بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ عظیم رک گیا۔ ملازمہ بھاگتی ہوئی عظیم کے پاس آئی اور روتے ہوئے عظیم کی منت کی۔ آپ فوراً واپس چلتے۔ بی بی کی حالت نازک ہے۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا ہے اور سانس اکھڑتی جا رہی ہے۔

عظیم پریشان ہو گیا۔ وہ واپس آیا۔ ٹھیلہ باہر کھڑا کیا اور بھاگتا ہوا وہ کمل کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمل فرش پر گھٹڑی کی صورت میں پڑی تھی۔ عظیم نے جھک کر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور پلنگ پر لٹا دیا۔ کمل نے آہستہ آہستہ



غلام نے مکمل کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر سہلاتے ہوئے کہا۔ تم میری جان ہو۔  
سہمی سہمی سی آواز میں مکمل نے کہا۔

کافی دیر بعد مکمل سنبھلی۔ پھر اس کی یوں نحیف اور کمزور آواز سنائی دی گویا وہ  
فضائے الم میں بھاگ بھاگ کر تھک گئی ہو۔

عظیم! میری جان! میرے بعد سیبل کا خیال رکھنا۔ آپ کے سوا اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ کھل کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی تھی۔ اور اس کے آنسو اس کے گلابی گالوں پر پڑتے ہوئے اس کی لمبی سفید گردن پر

گرنے لگے تھے۔

غظیم نے چونک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔  
 مایوسی کی باتیں نہ کرو۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ مٹھریں ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔  
 کل نے بڑی ہی مشکل سے غظیم کا وہ ہاتھ جو اس کے منہ پر رکھا تھا۔ تمام لیا۔ اور  
 غظیم کی ہڈی کو انتہائی کوشش کے بعد چومتے ہوئے کہا۔

میں ایک مسافر ہوں اور رخصت ہو رہی ہوں۔ میں غم اور دکھ کے سوا  
 آپ کو کچھ نہ دے سکی۔ میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ ————— کل لمحہ  
 بھر کے لیے خاموش ہو گئی۔ غظیم کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے اور اس نے  
 دارفنگی کے عالم میں کل کو اپنی گود میں سمیٹ لیا تھا۔

چند لمحوں بعد کل کی ٹوٹتی ہوئی آواز پھر سنائی دی۔

میں ————— میں اس جہاں میں آپ کا انتظار کرونگی ————— آہ

غظیم ————— کل کے ہاتھ سے غظیم کا ہاتھ چھوٹ گیا اور اس کی گردن ایک طرف  
 ڈھلک گئی تھی۔ غظیم نے چونک کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ بچاری مرچکی تھی۔ عمارت  
 کے سارے کارکن وہاں جمع ہو گئے تھے اور نے لگے تھے۔ غظیم جو کل کو گود میں پیے  
 رو رہا تھا۔ اس مسافر کی طرح تھا جسے لٹ کر بیکتا، شہنا اور بے سرو سامان کر دیا  
 گیا ہو۔





کھل کی کفن میں لپیٹی ہوئی لاش اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھائے عظیم اس کے کمرے سے باہر نکلا۔ بوڑھی ملازمہ نے بڑی محنت سے کھل کی لاش کو سوارہ تھا۔ عظیم جب ڈور تھی کے آفس کے قریب آیا تو وہ ڈور تھی اپنے کاندھوں کے ساتھ اس کمرے تھی اسے دیکھتے ہی عظیم نے نچتے میں چلا کر کہا۔

صلیب کے علمبردار وہ یہ ہے اس راستے پر چلنے کا انجام جس راہ پر تم نے اس لڑکی کو چلا دیا تھا۔ ظالمو! اس کی طرف دیکھو اس کے ہونٹ تم لوگوں سے کچھ کہنے کے لیے اب بھی کھلے ہیں۔ گناہ گارو! یہ وہ بے بس اور لاچار لڑکی ہے جس نے اپنے باپ کے ساتھ امن، سکون اور شانتی کی تلاش میں کراچی سے لاہور تک کا سفر کیا۔ لیکن تم لوگوں نے اس سے اس کا باپ چھین لیا۔ اسے

ایسی راہ پر ڈال دیا۔ جوان منزلوں کی طرف جاتی ہے۔ جہاں ہر وقت گھیرا اندھیرا اور بھیاں تک تاریکی رہتی ہے۔ گندگی اور بے حیائی کے ناخداؤ مرنے والی یہ محبوبہ بے بس لڑکی بھی خدا رکھتی ہے۔ اور وہ خدا ایک روز تمہارے ان اعمال بد کی تم لوگوں کو منرا ضرور دیگا۔ عظیم سر جھکانے آگے بڑھ گیا۔

کمل کی لاش اٹھائے عظیم باہر آیا اور لاش اس نے اپنے ٹھیلے میں ڈال دیا۔ اور سر جھکانے آہستہ آہستہ وہ اپنے ٹھیلے کو کھینچنے لگا۔ آج پہنچوں سے نکلنے والی صدائیں کیسی افسردہ اور اداس لگ رہی تھیں۔ اس کے پیچھے پیچھے ڈور تھی اور اس کے کا دکن بھی تھے۔ ان سب کا رُخ قبرستان کی طرف تھا۔

شام ہو گئی تھی۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی پھیل گئی تھی۔ آسمان پر کالے اوڑھے بادل چوگاڑ رہے تھے۔ کمل کو دفن کر کے عظیم ٹھیلہ کھینچتا ہوا مندر آیا۔ دہرہ اس نے ایک طرف کھڑا کیا اور الماس کے خاکستری تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ آج وہ حد سے زیادہ اداس تھا۔ زندگی کی شاہراہ پر بچا رہ لٹ جو گیا تھا۔ اس کا کتا بھی اس کے پاؤں کے قریب بیٹھ گیا تھا دونوں نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ دونوں ہی بھوکے اور اداس تھے

تھوڑی دیر بعد کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔

عظیم! عظیم!

عظیم نے آنکھیں کھولیں اس کے سامنے بوڑھا شاموں اور آفتاب کمرے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر شاموں نے پوچھا۔



یہاں آکر کھوں بیٹھ گئے ہو؟ — عظیم جب خاموش رہا تو شاموں پھر  
 بولا۔ تمہارے انکل تمہیں لینے آتے تھے۔ عاصفہ پاگل ہو چکی ہے۔ تمہارے  
 انکل کہہ رہے تھے وہ اسی کمرے میں بند ہے جس میں کبھی تم ہوا کرتے تھے۔ تمہارے  
 انکل اس کا علاج کر رہے ہیں۔

عظیم جب پھر بھی خاموش رہا تو شاموں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے  
 پدرانہ شفقت میں پوچھا۔

آج دیر سے لوٹے ہو کہاں چلے گئے تھے؟  
 گلے میں پھنسی پھنسی سی آواز میں عظیم نے جواب دیا۔  
 آج میں اس زندگی سے تھک گیا ہوں بابا!  
 شامو پگل کر رہ گیا۔ کیا ہوا میرے بیٹے!  
 عظیم بائبل بچوں کی طرح سک کر رو پڑا۔  
 مکمل مر گئی بابا!

شاموں کے بدن پر جیسے کسی نے اُبلتا ہوا پانی انڈھیل دیا ہو لڑتی آواز  
 میں اُس نے پوچھا۔

مکمل مر گئی؟ مگر کب۔

سکیوں میں عظیم نے کہا۔

میں ابھی ابھی اسے دفن کر کے آ رہا ہوں۔ ان ظالم لوگوں نے اسے مجھ سے  
 چھین لیا ہے۔ پھر عظیم بُری طرح پھٹ پڑا۔

میں ہار گیا ہوں بابا !  
 تقدیر کی ٹھوکروں نے مجھے دبوچ کر شکست سے دو چار کر دیا ہے ۔  
 کس سے گلہ کروں ۔  
 کس سے شکوہ کروں ۔

کسے پکار پکار کہوں کہ میں مظلوم اور بے بس بنا دیا گیا ہوں ۔  
 کس سے کہوں ان نفس پرست لوگوں نے مجھے دوزخ کی تاریک اور  
 سلگتی خاروں میں دھکیل دیا ہے ۔ اپنی تو مجھے سنبھلنے کی توفیق عطا فرما ۔ میری قسمت  
 میں اگر یہ بھی نہیں تو اے دونوں جہاں کے مالک ! مجھے موت دے دے تاکہ میں  
 سب کچھ بھول جاؤں ۔

باہر اب بارش ہونے لگی تھی ۔ شاموں نے اپنے آنسو پونچھے اور غلیم کا  
 ہاتھ پکڑ کر کہا ۔

اٹھو اندر چلو بیٹے ! بارش شروع ہو گئی ہے ۔  
 غلیم اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھا ۔ شاموں اور آفتاب اس کے پیچھے پیچھے  
 تھے ۔ کمرے میں آکر لیٹر پر بیٹھنے کے بجائے غلیم فرش پر ہی دیوار سے ٹیک لگا  
 کر بیٹھ گیا اور آنکھیں موندھ لیں ۔

شاموں نے منت کے انداز میں کہا ۔

اٹھ کر لیٹر پر بیٹھو بیٹے !

لرزتی اور پھٹی پھٹی آواز میں غلیم بولا ۔



بابا! آج میں اداس ہوں آج ————— آج مجھے وہی گانا سناؤ جو تم لوگ  
اس روز گارہے تھے جس روز میں اس مندر میں داخل ہوا تھا۔ سناؤ بابا! انکار  
نہ کرنا میرا دل ٹوٹ جائے گا۔

شاموں اور آفتاب دونوں دورہے تھے۔ پھر شاموں نے لکڑی کی ایک  
پٹی کھول کر اس میں سے اپنا ہار مونیم نکالا۔ آفتاب بھی آگے بڑھا اور اسی پٹی میں  
سے اس نے اپنا ڈھولک نکالیا۔ دونوں عظیم کے سامنے بیٹھ گئے۔ دونوں  
کچھ دیر تک ساز کی ہم آہنگی درست کرتے رہے۔ پھر —————  
پوڑھے شاموں کی بین کرتی دل فگار و غم زدہ آواز سنائی دی۔

میرے ہمدرد! میرے رفیقو!

قبل اس کے مسجدوں میں اذان ہو اور کوڑھ گراپنے چاک کو حرکت دیں۔  
قبل اس کے طویل شب کی بیداری کے بعد راہب اٹھیں اور عبادت کی  
گھنٹیاں بجائیں۔

میرے ساتھیو! میرے چارہ گرد!

اس سے پہلے کہ پھیرے اپنی کشتیوں کے بادبان کھول دیں۔  
اس سے پہلے کہ سورج کی تپتی شعاعیں عدم کی آتشی خوشبو لیکر چاروں طرف  
بکھر جائیں۔

اس سے پہلے کہ فطرت کے ہاتھ تخلیق اور فنا کے لیے اٹھیں اور اس فانی  
جہاں میں خوشی اور ماتم کے گیت سنائی دیں۔

اٹھو!

ہم محنت کر کے اپنے لیے امن و سکون کے جزیرے تلاش کریں۔ ورنہ  
غرابت کے شعلے اپنی آگ اگلتی زبانیں نکالے ہماری طرف بڑھ کر ہمیں خاکستر  
کر دیں گے۔

میرے دوستو! میرے رفیقو  
اٹھو!

بلند و بالا خیالات کی شکین توڑ کر ہم اپنے لیے خشک روٹی اور باسی بنری  
کا سامان کر لیں۔ میرے فرزندو! آؤ۔ دنیا کی ابتدا اور آغاز کے گیت گائیں اور  
ظلمت میں اپنے لیے نور کی تلاش کریں۔ اگر ہم اکناف عالم میں پھیل کر محنت اور کوشش  
کریں تو تادمیک رات ایک ماں کی طرح ہمارا ساتھ دے گی۔

آؤ! آؤ! دوستو! محنت کشتی اور علو ہمتی کے ساتھ آپس میں روحی معاہمت کر  
کے ہم انسانیت کو گرسنگی کے گردھوں اور قنوطیت کے نشیب سے نکال لیں۔  
گیت ختم ہو گیا۔ شاموں نے ہامو نیم بجانا بند کر دیا۔ آفتاب کے ہاتھ ڈھونڈ  
پر ساکت ہو گئے۔ غلیم جو جھکائے دو رہا تھا۔ کھڑا ہو گیا۔ شاموں نے بیتاب ہو  
کر پوچھا۔

کہاں چلے ہو بیٹا!

آنکھیں خشک کرتے ہوئے غلیم نے کہا۔

اپنے آخری ساتھی کی تلاش میں۔



باہر بارش ہو رہی ہے بیٹے! دیکھو بادل کیسے گرج رہے ہیں اور بجلی جھپک

رہی ہے۔

دروازے پر کھڑے ہوتے ہوئے غلیم نے کہا۔

فطرت کے یہ جنگجو غنا میرا راستہ نہیں روک سکتے بابا! میں ایک ایسے مسافر

کی تلاش میں جا رہا ہوں جو برسوں سے میرا انتظار کر رہا ہے۔ آج —————  
آج کی شب اس کا طویل انتظار ختم ہو جائیگا۔

کب لوٹو گے؟

کل آؤں گا۔

غلیم مندر سے نکل کر شرک پر آیا۔ اس کا کتا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ غلیم نے

رکشہ کیا۔ کتے کو بھی اس نے اپنے ساتھ بٹھانا چاہا۔ پر وہ رکشے کے اندر نہ آ رہا

باہر ہی کھڑا رہا۔ رکشہ جب چل دیا تو کتا ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔

اپنے گھر کے سامنے آکر غلیم نے رکشہ فارغ کیا اور اپنے کتے کے ساتھ اپنے

گھر داخل ہوا۔ اس کمرے کے اندر جو کبھی اس کا ہوا کرتا تھا چھن چھن کر روشنی

باہر آ رہی تھی۔

بارش میں غلیم کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ آسمان سے زوردار مینہ برس

رہا تھا۔ غلیم آگے بڑھ کر اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ شیشے میں سے

اس نے اندر دیکھا۔ آریہ غلیم کے ملنگ پرلیٹی ٹیبل لمپ کی روشنی میں مطالعہ کر

رہی تھی۔ غلیم تھوڑی دیر تک شیشے میں سے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے دروازے

پرد تک دی۔

آسیہ نے کتاب بند کر کے میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

کون ہے؟

غظیم کی ڈوبی ڈوبی، مدھم اور مغموم آواز سنائی دی۔

میں غظیم ہوں!

آسیہ اچھل کر بلیک سے اتری۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی بے پایاں مسکراہٹ۔ غظیم کے آنے کی خوشی میں وہ چیل پہننا بھول گئی تھی اور نیچے پاؤں دروازے کی طرف بھاگی۔ اس نے جب دروازہ کھولا تو غظیم اندر داخل ہوا۔ وہ بارش میں بھگیا ہوا تھا اور پکڑے پکڑے نچر رہے تھے۔

آسیہ نے غظیم سے قریب ہوتے ہوئے بڑی آس اور اُمید میں پوچھا کیا آپ — غظیم نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

میں ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آگیا ہوں۔

آسیہ پھول کی طرح کھل اٹھی — آپ کے اس ساتھی کا کیا ہوا جس کی آپ کو تلاش تھی۔

غظیم کا سر جھک گیا تھا۔

وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھین لیا گیا ہے۔

آسیہ آگے بڑی اور وارفتگی کے عالم میں دالہانہ طور پر وہ بری طرح غظیم سے لپٹ گئی اور اپنا سر غظیم کی چھاتی پر رکھتے ہوئے اس نے پرسکون پہچے میں



کہا

آپ میرے ہیں۔

عظیم نے بھی آسیہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ باہر ابھی تک موسلا دھار  
بارش ہو رہی تھی۔ کالے سیام بادل ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگتے ہوئے  
چنکاڑے دے رہے تھے اور ————— اور بجلی کی تیز لہریں بار بار آسمان کے ایک  
سرے سے دوسرے سرے تک کوند جاتی تھیں۔ بائیں طرف سعادت کے مکان  
کی طرف عاصفہ کے جنونی قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ وہ وہاں ایک کمرے  
میں بند تھی۔ پاگل جو ہو گئی تھی۔

ختم شد

جناب اسلم راہی ایم اے کا ولولہ انگیز تاریخی ناول تاریک رزم گاہ  
 مادرِ وطن کی آزادی کے لئے ہر شے والے جیالوں کی داستان عزم و شجاعت  
 اور دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والا تاریخی ناول۔ بڑا سائز ۵۵۷ صفحات  
 سفید کاغذ قیمت صرف - ۳۶ روپے۔

## مصنف کی دیگر تاریخی کتب

۳۳/۰	موت کے مسافر	۳۳/۰	قتیبہ بن مسلم
۳۰/۰	سنہری غول	۳۳/۰	صقلیہ کا مجاہد
۳۰/۰	نیشاپور کا شاہین	۳۰/۰	صلیب و حرم
زیر طبع	عتاب	زیر طبع	صواری کی آگ

## روحانی کتب

۲۴/۰	رٹکی اس گلی کی	۲۴/۰	خدا کہاں ہے؟
۲۴/۰	اس جلتے جہاں میں	۲۴/۰	جلتے بجھتے لوگ
	نزل دور ہے زیر طبع		

مکتبہ القیش چوک اردو بازار لاہور